غیر سیاسی اسلامی تحریکیں

تنظیم اسلامی، تحریک ختم نبوت، تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی

غلام حیدر

ASIAN RESEARCH INDEX
2023

برصغیر کی چار غیر سیاسی اسلامی تحریکوں کا تعارف

غیر سیاسی اسلامی تحریکیں

تنظیم اسلامی، تحریک ختم نبوت، تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی

غلام حیدر

ایشین ریسرچ انڈکس

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اس کتاب کے حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔ کسی بھی قسم کی اشاعت مصنف کی تحریری اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔

نام کتاب	غیر سیاسی اسلامی تحریکیں: تنظیم اسلامی، تحریک ختم نبوت، تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی
مصنف	غلام حیدر
ناشر	ایشین ریسرچ انڈکس، اسلام آباد
طبع	دوم
اشاعت	2023
آئی ایس بی این	9786277680015
آے آر آئی آئی ڈی	1681275197971
آن لائن حصول	https: //asianindexing.com/
لائسنس	Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

التماس: انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتاب کی پروف ریڈنگ، تسہیل، طباعت اور اشاعت میں نہایت احتیاط برتی گئی ہے۔ تاہم غلطی کا احتمال بہر حال باقی رہتا ہے۔ بشری تقاضے اپنی جگہ ہیں۔ لہذا کتاب میں اگر سہواً کوئی غلطی رہ گئی ہو یا صفحات درست نہ ہوں تو مصنف، ناشر، پروف ریڈرز اور طابع ہر قسم کے سہو پر معافی کے طلب گار ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب میں اگر کسی بھی قسم کی غلطی یا خامی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درستگی عمل میں لائی جاسکے۔

انتساب

محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کے نام جن کی زندگی سب کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔

فہرست عنوانات

مقدمہ .... ج

حرفِ آغاز .... ز

پہلا باب: تنظیم اسلامی 1

بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد کا تعارف 3

جماعت اسلامی سے تعلق اور علیحدگی ...4

تحریک جماعت اسلامی کا دور اول 9

مولانا مودودیؒ کا نقطہ نظر 11

تنظیم اسلامی کا تاریخی پسِ منظر 13

قراردادِ رحیم آباد 15

تقریر مولانا امین احسن اصلاحی 16

تقریر مولانا عبد الغفار حسن 16

سابقینِ جماعت اسلامی کی کنارہ کشی ...18

تنظیم اسلامی کی تشکیل 18

تأسیسی اجلاس 20

قرآنِ مجید کا منتخب نصاب 21

منتخب نصاب حصہ اول 21

منتخب نصاب حصہ دوم 21

تنظیم اسلامی کا سالانہ اجلاس 25

تنظیم اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ 26

نظم 26

مالیات 27

دعوت 28

تربیت 29

تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت 29

تنظیم میں شمولیت 29

تنظیم کے اساسی نظریات 30

عقائد اور بنیادی تصورات 30

نظامِ بیعت 31

معاشرے میں انقلاب کا طریقہ کار ...32

پہلا مرحلہ دعوت 32

دوسرا مرحلہ: تنظیم 33

تیسرا مرحلہ: تربیت 34

چوتھا مرحلہ: صبر محض 35

پانچواں مرحلہ: اقدام اور چیلنج 36

چھٹامرحلہ: مسلح تصادم 36
انقلاب کی توسیع و تصدیر 37
اقدام کے لئے لازمی شرائط 39
تین ممکنہ نتائج 40
قیام پاکستان کی غرض وغایت اوربانی تنظیم کا
نظریہ 42
دوسراباب: تحریک ختم نبوت 46
مرزاغلام احمد کے حالات زندگی......48
پیدائش 48
تعلیم 48
ملازمت 49
مرزاغلام احمد کی وفات 49
دعوت غلام احمد کاتدریجی ارتقاء....50
مرزاغلام احمد قادیانی بطور مصنف .. 51
مامور من اللہ ۱۸۸۰ 53
دعویٰ مجددیت ۱۸۸۹ء 53
مرزاقادیانی بطور محدث 54
مرزاقادیانی بطورمثیل مسیح 55
مرزابطور ظلی بروزی نبوت 56
مستقل نبوت کادعویدار 57
تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء..........58
خواجہ ناظم الدین کادوراورقادیانیوں کے خلاف
عوامی جدوجہد 59
قادیانیوں کاتاریخی جلسہ 60
مرزامحمود کااعلان 60
جلسہ میں عوامی ردعمل اور اس کے بعد نتائج
61 ....
ملتان جلوس پرفائرنگ 61
۲جون ۱۹۵۲ء کراچی کنونشن (مجلس
مشاورت) 62
آل مسلم پارٹیزکنونشن 62
مجلس عمل کاقیام 63
۱۴اگست ۱۹۵۲ء 64
وزیراعظم کے رویہ پرعوامی ردعمل 64
وفد کی آخری ملاقات اورالٹی میٹم ..64
عوام میں شدید غم وغصہ 65
لاہورمیں جلسہ عام 65
الٹی میٹم کی مدت کاخاتمہ 66

تحریک راست اقدام 66
عوام کا ردّ عمل 67
مارشل لاء ۱۹۵۳ء..............67
۱۹۵۳ء کی ناکامی کے اسباب واثرات 68
تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء 69
سانحہ ربوہ 74
تیسرا باب: تبلیغی جماعت 77
تعارف 79
مولانا محمد الیاسؒ.................80
مولانا محمد الیاسؒ کا اخلاص 82
تبلیغی جماعت کے اصول 84
تبلیغی جماعت اور علماء کا کردار........89
تبلیغی جماعت اور خواتین کا کردار.....90
تبلیغی جماعت کی فکر کا تنقیدی جائزہ ... 95
چوتھا باب: دعوت اسلامی............ 97
بانی دعوت اسلامی کا تعارف 99
دعوت اسلامی کا تعارف 102
دارالافتاء کا قیام 103
انٹرنیٹ کے ذریعے دین کی خدمت 103
مجلس تحقیقات شرعیہ 103
المدینۃ العلمیہ کا قیام 104
تنظیم خدام المساجد 104
مدنی مذاکرہ.........................104
تنظیمی نظم وضبط 105
دعوت اسلامی کی سرگرمیاں 106
۱۔ فیضان سنت کا درس............106
۲۔ نیکی کی دعوت 106
۳۔ مدنی قافلے 106
۴۔ مدنی انعامات 107
۵۔ ہفتہ وار اجتماع 107
۶۔ مدنی تربیت گاہ...............108
۷۔ مکتبہ المدینہ 108
۸۔ مجلس فیضان قرآن 108
۹۔ مدنی چینل 109
تقابل دعوت اسلامی و تبلیغی جماعت.109
مماثلت 109

اختلافی نکات 111

نتائج 112

خاتمہ کلام 113

کتابیات 114

مقدمہ

ایک انسان جب اس کائنات پر غور و فکر کرتا ہے تو اسے کوئی بھی چیز بے مقصد نظر نہیں آتی۔ ہر چیز کی تخلیق کا ایک مقصد ہوتا ہے پھر آخر انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ انسان کیوں پیدا کیا گیا؟ کیا اس لیے کہ دنیا میں خوب عیاشی کی زندگی گزارے، دوسروں پر ظلم کرے اور پھر مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے؟ یا اس لیے کہ لوگوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتا رہے اور اپنے حق کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے؟

جب ہم اس کرۂ ارض پر موجود انسانوں کے حالات کا بنظر غائر جائزہ لیتے ہیں تو دونوں طبقات موجود پاتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کے جانور بھی ائر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ انسان بھی اسی زمین پر بستے ہیں جن کی بود و باش چوپائیوں جیسی ہے۔

بچپن سے ہی جب میں اس معاشرتی تفاوت پر نظر دوڑاتا تو میرا دل خون کے آنسو روتا اور میرا ضمیر مجھے کچوکے دے کر پوچھتا کہ کیا غریب پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ وہیں سے پانی پیئے جہاں سے چولستان کی گائے پانی پیتی ہے اور کیا امیر پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ اپنا پینے کا پانی بھی فرانس سے منگوائے اور دنیا کی رنگینیوں سے خوب لطف اندوز ہو؟ معاشرے میں موجود غیر عادلانہ نظام نے مجھے پاکستان کی سیاسی اور غیر سیاسی، دینی و غیر دینی جماعتوں کا جائزہ لینے پر مجبور کیا اور میں نے بہت قریب سے مختلف قائدین کو دیکھا اور جانچا۔

میں ایک مضطرب انسان ہوں۔ پاکستان کی سیاسی دینی تحریکوں پر پہلے ہی بہت کام ہو چکا ہے اور پھر میں نظریاتی طور پر سیاسی دینی تحریکوں سے کافی بعد رکھتا ہوں، اس لیے غیر سیاسی دینی تحریکوں کا انتخاب کیا گیا۔ قرآن حکیم میں انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ کی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الذاریات میں الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (الذاریات:۵۶)

"میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"۔

گویا انسان کا مقصدِ حیات ہی بندگی ہے، غایت تخلیق ہی بندگی ہے۔ بندہ کے معنی ہیں غلام اور غلام ہمہ وقت اور ہمہ تن غلام ہوتا ہے۔ غلامی اور ملازمت میں یہی تو فرق ہے کہ ملازمت کسی معین کام کے لیے ہوتی ہے۔ جو شخص دفتر میں چپڑاسی ہے وہ چپڑاسی کا کام ہی کرے گا، کوئی اور کام تو نہیں کرے

گا۔ پھر ملازمت معین وقت کے لیے ہوتی ہے۔ ملازم سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ اسے چار گھنٹے کام کرنا ہے یا آٹھ گھنٹے۔ اس کے بعد وہ آپ کا ملازم نہیں۔ لیکن غلامی یا بندگی ہمہ وقت اور ہمہ تن ہے۔ ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ محض بندگی یا غلامی "عبادت" نہیں ہے جب تک کہ اس میں پرستش شامل نہ ہو۔

پرستش میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے زر پرست وہ ہے جس کو مال سے انتہائی محبت ہو۔ وطن پرست، قوم پرست اور شہرت پرست جیسے الفاظ ہمارے ہاں کثرت سے مستعمل ہیں۔ چنانچہ عبادت کا مفہوم ہوگا اللہ کی بندگی اور اس کی پرستش۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں عبادت کا صحیح تصور موجود نہیں۔ ایک مسلمان کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے کے لئے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ کر اور ماہ رمضان میں روزے رکھ کر گویا کہ اللہ تعالیٰ پر احسان عظیم کر دیا گیا۔ باقی کے معاملات میں بالعموم غفلت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ایک انسان کی زندگی کے دو گوشے ہوتے ہیں۔ (۱) انفرادی گوشہ (۲) اجتماعی گوشہ۔

انفرادی گوشے میں ہر انسان کے کچھ نظریات ہوتے ہیں۔ سوائے ایک دہریے کے ہر شخص اللہ تعالیٰ، آخرت وغیرہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ نظریات رکھتا ہے جنھیں عقائد کہا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ عبادت کا کوئی نہ کوئی تصور ہر طبقے میں پایا جاتا ہے۔ ایک انسان خواہ وہ پارسی ہو یا یہودی، ہندو ہو یا سکھ، عبادت کے بارے میں نظریہ رکھتا ہے، تیسری چیز جو انفرادی گوشے میں پائی جاتی ہے، وہ رسومات ہیں۔ ہر انسان کے ذہن میں ایک خاکہ موجود ہے کہ پیدائش کے وقت کیا رسومات اختیار کی جائیں، شادی کے موقع پر کیا کیا جائے، فوتیدگی کے موقع پر مردے کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

انسان کی زندگی کا یہ گوشہ جسے انفرادی گوشہ کہتے ہیں، مذہب کہلاتا ہے۔ اسلام مذہب کے معاملے میں مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ایک مسلمان کے عقائد کیا ہونے چاہییں۔ عبادات کیا ہیں، پیدائش، شادی، فوتیدگی پر کیا کرنا ہے؟ اسلام کی رہنمائی مکمل ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت انتہائی ضروری ہے کہ مذہب پر عمل کے راستے میں حکومتیں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ کیونکہ یہ ایک شخص کا نجی معاملہ ہوتا ہے۔ اور نجی معاملات میں یہ آزادی ہے کہ میں جو چاہے عقائد رکھوں، جیسے چاہوں عبادت کروں اور اپنی مرضی کی رسومات اختیار کروں۔

انسان کی زندگی کا دوسرا گوشہ اجتماعی ہے۔ جب ایک شخص کا دوسرے لوگوں کے ساتھ رابطہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے۔ اب خاندانی زندگی کے لئے اسے کچھ قواعد وضوابط کی ضرورت ہے۔ میاں بیوی کے حقوق و فرائض، والدین اور اولاد کے مابین تعلقات کی نوعیت، وراثت کے معاملات وغیرہ کے بارے میں اُسے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اسلام اس معاملے میں عائلی قوانین فراہم کرتا ہے اور قرآن وسنت کے ذریعے خاندانی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اجتماعی گوشے میں جب ایک انسان معاش کی خاطر دوڑ دھوپ کرے گا تو حرام اور حلال، صحیح اور غلط کا سوال پیدا ہوگا۔ کیا کمایا جائے اور کہاں خرچ کیا جائے کا جواب اسلام دیتا ہے اور ایک معاشی نظام پیش کرتا ہے۔ نیز یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جب اجتماعی طور پر زندگی گزاری جائے گی تو لامحالہ کسی کو اپنا سربراہ بنایا جائے گا، امن وامان کے لئے کسی طاقت کی ضرورت ہوگی، جزاوسزا کا کوئی ضابطہ متعین کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اسلام ایک سیاسی نظام وضع کرتا ہے۔

محولہ بالا گفتگو سے نہ صرف یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام انفرادی اور اجتماعی گوشوں میں رہنمائی فراہم کرتا ہے بلکہ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ دراصل دین صرف اور صرف اسلام ہے۔ عیسائیت ہو یا یہودیت، ہندومت ہو یا جین مت، صرف انفرادی گوشے تک محدود ہیں۔ گویا کہ یہ مذاہب ہیں۔ جبکہ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انفرادی گوشے میں تمہارے عقائد کیا ہوں، عبادات اور رسومات کیا ہوں۔ نیز اجتماعی گوشے میں اسلام یہ بتاتا ہے کہ تمہاری معیشت میں سود نہیں ہونا چاہیے، معاشرت میں اسلام یہ بتاتا ہے کہ بحیثیت انسان سب برابر ہیں اور سب کو زندگی کی دوڑ میں برابر کے مواقع ملنے چاہیے۔ سیاست میں اسلام ہمارے سامنے یہ تصور رکھتا ہے کہ:

ومن لم یحکم بما انزل اﷲ فاولئک ھم الکفرون، ھم الظلمون، ھم الفاسقون۔(المائدہ: ۴۴،۴۵،۴۷)

”اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں،“

آج کے مسلمان کا المیہ یہ ہے کہ اسلام بحیثیت دین اس کی نظروں کے سامنے نہیں ہے، اس نے اسلام کو مذہب بنالیا ہے، جس کے نتیجے میں انسانی زندگی کا اجتماعی گوشہ ہدایت ربانی سے یکسر خالی ہو

گیاہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھنے والے مسلمان بھی سودی کاروبار میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ تہجد گزار لوگ بھی غیر اللہ کی حاکمیت پر نہ صرف قانع بلکہ مددگار نظر آتے ہیں اور مسجد و محراب کے وارث بھی اپنی بیٹیوں کو وارثت سے محروم کر دیتے ہیں (الاماشاء اللہ)۔

دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ جماعتی زندگی کی اہمیت مسلمانوں کی نظروں سے او جھل ہے۔ حالانکہ قرآن وحدیث مسلمان کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ جماعتی زندگی اختیار کرے۔ دین اسلام میں اہم امور زندگی اور شعائر دینی کی ادائیگی کے لئے اجتماعیت اختیار کرنے کی انتہائی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً:

1. سفر کے حوالے سے ہدایت ہے کہ ”

اذا خرج ثلا ثۃ فی سفر فلیومروا احدھم“(ابوداؤد)

”جب تم میں سے تین افراد سفر پر نکلیں تو چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔“

2. ارکان اسلام یعنی نماز، روزہ، اموال ظاہرہ پر زکوۃ اور حج کی ادائیگی اجتماعی نظم کے تحت ہوتی ہے۔

3. نماز جمعہ اور عیدین کی ادائیگی بغیر اجتماعیت کے ممکن نہیں۔ قرآن حکیم انفرادی واجتماعی، ہر سطح پر عمل کے لئے اجتماعیت اختیار کرنے کا حکم دیتاہے۔

ا۔ انفرادی زندگی میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کے لئے صادقین کی صحبت سے استفادہ ضروری ہے (التوبہ:۱۱۹)۔

۲۔ سورۃ العصر میں حق کی تلقین و تاکید کرنے کے لئے تواصی کا لفظ آیاہے جس کے معنی ہیں مل جل کر اور اہتمام کے ساتھ حق کی تبلیغ کرنا۔

۳۔ اقامت دین کی جدوجہد کے حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اللہ ایسے بندوں سے محبت فرماتاہے جو اس کے دین کے غلبے کے لئے جنگ کریں مگر اس طرح منظم ہو کر گویا کہ وہ ہوں سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔“(الصف:۴)

4. دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینے کے حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو خیر کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔“(آل عمران:۱۰۴)

اجتماعیت کی اہمیت احادیث کی روشنی میں:

۱۔عن عمرؓ عن النبی صلی االلہ علیہ وسلم قال علیکم بالجماعہ وایا کم والفر قۃ فان الشیطن مع الواحدوھومن الا ثنین ابعد من اراد بجبوحۃ الجنۃ فلیلز م الجماعۃ(ترمذی)

''حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم پر جماعت کا التزام کرنالازم ہے اور یہ کہ جدا ہونے سے بچو۔ پس شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے نسبتاً زیادہ دور ہوتا ہے''۔

جو کوئی جنت کی خوشبو کا طلبگار ہو پس وہ جماعت کے ساتھ جڑا رہے۔

۲۔ عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ ﷺ قال ید االلہ علی الجماعۃ ومن شذشذا لی النار (الجامع الصغیر)

''حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ بے شک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے جو کوئی جماعت سے علیحدہ ہوا،وہ علیحدہ کر دیا گیا جہنم کی طرف''۔

۳۔ عن زید بن ثابتؓ قال سمعت رسول اللہ ﷺ ثلاث لا یغل علیھن قلب مسلم اخلاص العمل للہ ومناصحۃ ولاۃ الامر ولزوم الجماعۃ فان دعوتھم تحیط من ورآئھم۔(ترمذی، ابوداؤد)

''حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ تین باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ایک مسلمان کا دل نفاق میں مبتلا نہیں ہوتا، عمل کا خالصتاً اللہ کیلئے ہونا، ذمہ دار حضرات کے ساتھ خیر خواہی ووفاداری کرنا اور جماعت کے ساتھ چمٹے رہنا کہ بے شک جماعت والوں کی دعائیں اسے محفوظ رکھتی ہیں۔''

مندرجہ بالا احادیث میں مسلمانوں کو الجماعۃ کے ساتھ رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ الجماعہ سے مراد پوری کی پوری امت مسلمہ ہے جبکہ وہ ایک امیر کی قیادت میں متحد ہو۔ البتہ بحالت موجودہ، دنیا میں الجماعہ موجود ہی نہیں اور مسلمان مختلف قومیتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ لہذا اس صورت حال میں مندرجہ بالا احادیث پر عمل کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی جماعت میں شامل ہونا چاہیے جو پھر سے الجماعہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

ایک عام آدمی یہ سوال کرتا ہے کہ معاشرے میں بے شمار جماعتیں موجود ہیں اور سب کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ درست انداز میں کام کر رہی ہیں تو پھر آدمی کس جماعت میں شامل ہو؟ یہ ایک اہم سوال

ہے جسے سرسری انداز سے نہیں لینا چاہیے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ جب ہمیں کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم بازار کا رخ کرتے ہیں۔ کیا بازار میں بہت سی دکانیں دیکھ کر ہم کپڑا خریدے بغیر واپس آجاتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ ہم نے کپڑا خریدنا ہے کیونکہ کپڑا ہماری ضرورت ہے۔ ایک دکاندار نے ہمیں مطمئن کر دیا تو اسی سے خریدتے رہیں گے ورنہ دکاندار بدل لیں گے۔ بعینہ معاملہ جماعتوں کا ہے۔

جماعتی زندگی ہماری ضرورت ہے، زیادہ جماعتوں کی موجودگی سے ہم اپنی ضرورت کو چھوڑ نہیں سکتے بلکہ ہم حتی المقدور کوشش کریں گے کہ کسی ایسی جماعت میں شمولیت اختیار کی جائے جو قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں دین اسلام کے غلبے کا کام کر رہی ہو، جس کی قیادت پر خلوص ہو، جو فرقہ واریت اور مسلک سے بالاتر ہو۔ اگر ایسی جماعت نہیں ملتی تو پھر ہمیں خود اٹھ کر یہ جماعت بنانا ہو گی کیونکہ آقائے نامدار ﷺ نے ہمیں جماعتی زندگی کا حکم دیا ہے۔ جامع ترمذی اور مسند احمد میں حضور اکرم ﷺ کی درج ذیل حدیث درج ہے۔

عن الحارث الاشعریؓ قال قال رسول ﷺ امرکم بخمس بالجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد فی سبیل اﷲ۔ [1]

حضرت حارث الاشعریؓ سے روایت ہے کہ فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے "میں تمھیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، جماعت اختیار کرنے کا، سننے کا، اطاعت کرنے کا، ہجرت کرنے کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا"۔

زیر نظر کتاب میں پاکستان کی چار غیر سیاسی دینی تحریکوں کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو کچھ صحیح لکھا گیا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جہاں خطا ہوئی اس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ اللہ تعالیٰ خطاؤں سے در گزر فرمانے والا ہے۔

غلام حیدر مگھرانہ
شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، پاکستان

[1] مسند احمد ۴/ ۱۳۰۔ سنن الترمزی (ح ۲۸۶۷)۔ کتاب الامثال، باب ماجاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

حرف آغاز

غیر سیاسی اسلامی تحریکیں (تعارف اور تجزیہ) ڈاکٹر غلام حیدر مگھرانہ کی تحقیقی کتاب ہے جسے ڈاکٹر مگھرانہ نے نہایت محنت، ذہانت اور جذبے سے مرتب کیا ہے۔ یوں تو ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کے تمام ادوار کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے عام طور پر اور اسلامی علوم کے طلبہ کے لیے خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ مگر اہل علم کے لیے امت کا دور اول اور دور حاضر خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ دورِ اول اس لیے کہ یہ امت کی تشکیل، تعمیر، عروج اور سطوت کا دور ہے۔ اس دور میں تشکیل و تعمیر امت کی رہنمائی کا سامان ہے۔

یہ عہد جناب رسالت مآب ﷺ اور آپ کے جانشین خلفاء راشدین کا عہد ہے۔ یہ عہد زمانے کے لحاظ سے ماضی کا حصہ ہے۔ مگر ہر دور کے مسلمانوں کے لیے ایسا ماضی جو حال سے جڑا ہوا اور مستقبل کی صورت گری کا ذریعہ۔ دورِ حاضر میں ہم پھر تشکیل امت اور تعمیر ملت کے مرحلے سے دوچار ہیں۔ پھر سے تشکیل و تعمیر کا مرحلہ اس بات کو عیاں کر رہا ہے کہ امت پر تفرقہ اور تخریب کا دور بھی گزرا ہے اور اس کے اثرات اب بھی موجود ہیں، جن سے امت کو پاک کر کے تشکیل و تعمیر کے راستے پر ڈالنا مقصود ہے۔ اس نیک مقصد کے لیے کوششیں ہر دور میں جاری رہیں۔ شاہ والی اللہؒ کی شخصیت کو دور زوال اور دور عروج کے لیے آغاز کی شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ سترویں صدی عیسوی کے اختتام تک ہمارا عروج رہا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں زوال شروع ہوا۔ اس عہد میں شاہ ولی اللہؒ نے علمی تحریک کے اسباب مہیا کیے۔

اسلام دین ہے۔ امت کے دور زوال میں دین اسلام کے احیاء کے لیے سیاسی اور غیر سیاسی دونوں طریقوں سے کام ہوا ہے۔ احیاء کے لیے کام کرنے والے ان دنوں گروہوں کے ہاں اسلامی لٹریچر ہی ماخذ کی حیثیت سے پیش نظر رہا۔ دراصل خلافت کے بعد ملوکیت کے رائج ہونے کی بنا پر اسلام کی بحیثیت مذہب حیثیت زیادہ نمایاں رہی۔ پھر راہبانہ تصورات درآنے کی وجہ سے ترک دنیا کو ترجیح حاصل ہو گئی اور مذہب روایات کا مجموعہ بن کر رہ گیا جیسا کہ اقبالؒ نے فرمایا:

حقیقت خرافات میں کھو گئی ۔۔۔ یہ امت روایات میں کھو گئی

احیاء دین کا تقاضا یہ ہے کہ خرافات کو دین اسلام کی حقیقت سے جدا کیا جائے اور روایات کی

بجائے اسلامی تعلیمات پر فوکس کیا جائے تاکہ زندگی گزارنے کا صیح طریقہ اور راستہ امت پر واضح ہو اور ہماری پستی بلندی میں اور زوال عروج میں تبدیل ہو جائے۔ اگرچہ احیائی عمل میں سبھی تحریکیں اور جماعتیں اس مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہیں مگر سیاسی اور غیر سیاسی کے صیح اور غلط ہونے کی بحث کے ساتھ ڈاکٹر گھرانہ کی یہ کوشش بھی اس پس منظر میں حق کی تلاش کی ایک کوشش ہے۔ جس کے لیے میری دلی دعا ہے کہ وہ بارآور ثابت ہو۔

عصر حاضر کی زبان نے ترقی کی منازل طے کرکے زندگی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرکے ان کے لیے الگ الگ اصطلاحات تخلیق کر دی ہیں۔ اگرچہ یہ تمام تصورات ہمارے ابتدائی لٹریچر میں بھی موجود ہیں مگر ملوکیت کے دبیز پردوں میں چھپ جانے کی وجہ سے صاف صاف نظر نہیں آتے۔ دورِ حاضر میں جہاں ملوکیت کی چولیس ڈھیلی پڑیں وہاں اہل علم نے دین اسلام کے تمام اجزاء کو کھول کر بیان کیا اور ان سب کو ایک نظام زندگی کے اجزاء کے طور پر واضح کیا اور ان اجزاء سے پھر نظام کی شکل نکھار کر پیش کی۔

شاہ ولی اللہؒ کے بعد ان اہل علم میں سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی بلند مقام کے حامل ہیں۔ ان حضرات کے ہاں اسلام سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے لیے محض اخلاقی ضوابط تک محدود نہ رہا بلکہ سیاسی نظام، معاشی نظام اور معاشرتی نظام کی واضح تعلیمات پر مشتمل دین یعنی نظام زندگی تک وسعت اختیار کر گیا۔ یہ نظام بھی اللہ نے زندگی میں قائم کرنے کے لیے نازل فرمایا۔

چنانچہ نبی ﷺ نے دین قائم فرمایا اور امت میں دین قائم رہا مگر دور زوال میں امت اس دین کو قائم نہ رکھ سکی۔ جس مسلم ملک کو جس مغربی ملک نے فتح کرکے اس پر اپنی حکومت قائم کی وہاں اس ملک نے اپنا ملکی نظام قائم کر دیا اور اسلام کو مذہب بنا کر انفرادی زندگی کے شعبوں تک محدود کر دیا۔ مسلمانوں نے ملوکیت کے زیر اثر ہونے کی بنا پر اس کی زیادہ مزاحمت نہ کی بلکہ اس تصور مذہب کے بڑے حصے کے ساتھ سازگار رہے۔ بالاخر مغرب کے بستر بوریا لپیٹنے کا وقت آن پہنچا۔ محکوم مسلم ممالک میں آزادی کی تحریکوں نے بیداری پیدا کی۔

سیاسی آزادی کے ساتھ زندگی کے نظام کو اسلام کے تابع کرنے اور آزادی کے بعد ملک کا نظام اسلامی تعلیمات کے مطابق قائم کرنے کی زوردار آواز ہندوستان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بلند

کی اور اس کے لیے ایک جماعت قائم کی جس نے شہادت حق، اقامت دین کی اصطلاحات کے ذریعے اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کا باقاعدہ مطالبہ لے کر میدان عمل میں قدم رکھا۔

1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی نے برصغیر پاک وہند میں ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ اس سانحہ نے مسلم علماء و امراء کے ذہنوں کو بہت بری طرح متاثر کیا۔ اس شکست میں سے ہی بہتر مستقبل کے اسباب پیدا ہوئے۔ ہر گروہ کو ملت اسلامیہ کی بھلائی اور اسلام کے دفاع کا جو طریقہ سمجھ میں آیا اس نے اختیار کر لیا۔ علمی سطح پر پرانے نظام تعلیم میں سے اسلامی مضامین پر مشتمل کتب پڑھانے کے لیے مدرسہ جات تعمیر کیے گئے۔ اس کی نمائندگی دارالعلوم دیوبند نے کی۔ انگریز حکمرانوں نے جدید علوم کے ذریعے ترقی کر کے ہزاروں میل دور آکر ہندوستان کی حکومت ختم کر کے اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ کچھ خیر خواہان ملت نے سمجھا کہ انگریز حکمرانوں نے قلم میں مہارت کی بنا پر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو بھی یہ علوم حاصل کرنے چاہییں۔ اُن کو جدید علوم کی طرف راغب کرنے کے لیے انہوں نے انگریزی تعلیم کے ادارے قائم کرنے پر زور دیا۔ اس کی نمائندگی علی گڑھ نے کی۔ علم کے بعد عمل کے میدان میں مسلمان پھر دو حصوں میں تقسیم ہوئے۔ ایک گروہ نے سیاست میں قدم رکھا اور کار حکمرانی کے ذریعے مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کا کام سنبھالا۔ دوسرے گروہ نے اسلام کی عبادات پر عمل اور اخلاق کو ترجیح بنایا اور وعظ و تقریر کے ذریعے عام مسلمانوں میں عبادات و اخلاق کو رائج کرنے پر اپنا زور صرف کرنا شروع کیا۔ ہر گروہ ملت اسلامیہ ہندوستان کا خیر خواہ اور اپنے خیال کے مطابق خدمت دین پر گامزن رہا۔

ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے مفاد کی حفاظت اور دین اسلام کے دفاع کی ان مساعی نے طویل سفر طے کیا۔ بالاخر تقسیم ہند بر بنائے مسلم و غیر مسلم کی قرار داد پاس ہوئی جسے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں منٹو پارک لاہور میں پاس کیا۔ اس قرار داد میں ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی آزاد حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ پاس ہوتے وقت یہ قرارداد لاہور تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قرار داد پاکستان بن گئی اور الگ وطن کا نام پاکستان بن گیا۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ عوام کی زبانوں پر رائج ہو کر عوام نے پاکستان کے لیے آئندہ کے نظام کی صورت گری خود کر دی۔ جبکہ مسلم لیگ کی قیادت نے علامہ

اقبال کے افکار کو اپنی تحریک کے لیے راہنما بنایا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی پاکستان میں اسلامی فلاحی جمہوری نظام قائم کرنے کا اعلان کیا۔ اس صورت حال میں ایک اور آواز نے قوم کے پڑھے لکھے طبقے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے اسلامی سیرت و کردار کے لوگ ہونے چاہیں۔ جو مسلمان علی گڑھ سے انگریزی اسلوب و زبان کے ذریعے تیار ہوئے ہیں وہ اسلامی تعلیمات کے علم سے بے خبر اور عمل سے بیگانہ ہیں۔

مسلمان سے اسلام کا مطالبہ تو نظام کو اس کے مطابق قائم کرنے کا ہی ہے۔ مگر اسلامی نظام قائم کرنے کا اہل وہی ہو سکتا ہے جو اسلام کے علم سے واقف اور سیرت و کردار میں اسلام کا عملی نمونہ ہو۔ مولانا مودودی نے اسلام کو بحیثیت نظام زندگی متعارف کرانے اور مسلمانوں میں اسلامی سیرت و کردار پیدا کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ سیاست کے میدان میں کارکنان اور قائدین سے جن خصوصیات کا مطالبہ کیا جاتا ہے ان کا تعلق سیاست کے تقاضوں سے ہوتا ہے۔ جبکہ مذہب کے میدان میں جب خوبیوں کو معیار بنایا جاتا ہے وہ عبادات، اخلاق، للہیت، فکر آخرت اور دنیا سے بے رغبتی وغیرہ کے اعلیٰ اوصاف ہیں۔ دنیا میں یہ دو دھارے الگ الگ رہتے ہیں اور لوگ دونوں سے حسب استطاعت استفادہ کرتے ہیں۔ جبکہ مولانا مودودی نے اسلام کی جو تشریح کی وہ علامہ اقبال کے افکار کی ترجمانی تھی۔ مثلاً اقبال نے کہا:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

مولانا مودودی نے فرمایا مسلمان اپنی زندگی سے دورنگی کو ترک کر دیں، وہ اپنے اندر خالص مومنانہ صفات بھی پیدا کریں اور سچے مومن بن کر قیادت پر خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو فائز نہ رہنے دیں بلکہ اقتدار صالحین کے ہاتھ میں دیں تاکہ وہ اسلام کے مطابق نظام کو قائم کریں اور قائم رکھیں۔

روایتی مذہبی راہنماؤں کو اس فکر میں سیاست نظر آئی۔ چنانچہ ایک طبقے نے اسلام کو سیاست کی آلودگی سے بچانے کے کے روایتی مذہبی اقدار کی زور دار طریقے سے تبلیغ کا راستہ اپنایا۔ روایتی علماء کرام نے اس تصور کے رد میں لٹریچر شائع کیا۔ عام مسلمان تو اپنے طقے سے جڑے رہے۔ جس نے جس خاندان میں جنم لیا اسی کے تصور مذہب کو اپنا لیا۔ مسئلہ ان افراد کے لیے پیدا ہوا جو ایک رائے پر اکتفا نہیں کرتے۔ دوسری آراء کا بھی جائزہ لیتے اور خود کسی نتیجہ فکر پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ایسے متلاشیان حق ہی

دراصل کسی قوم کی حیات کی علامت ہوتے ہیں۔ کیونکہ افکار ہی سے تازہ جہاں نمودار ہوتے ہیں اور سوچنے سمجھنے والے ذہن قوم کی تعمیر کے ذریعے نئی دنیا تعمیر کرتے ہیں۔ غور و فکر کرنے والوں کے لے سوچنے اور سمجھنے کا نیا دروازہ کھلتا ہے۔

ڈاکٹر غلام حیدر مگھرانہ بھی افکار تازہ سے نئی دنیاؤں کی تخلیق پر یقین رکھنے والی بے چین روح اور بے قرار جذبوں سے مالا مال ہیں۔ اس لیے کسی ایک مقام پر پڑاؤ اور ہمیشہ کے لیے وہاں پڑے رہنا انہیں گوارانہ ہوا۔ لہذا تلاش حق کی جستجو انہیں در در لیے پھری۔ اس راہ میں انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ جس جگہ قرار آیا تھوڑی دیر کے لیے قیام کیا مگر بے قرار دل انہیں نئے سفر پر لے کر چل کھڑا ہوا۔ لٹریچر کے ساتھ ساتھ اہم شخصیات سے بذریعہ ملاقات استفادہ بھی ان کے اس سفر کا توشہ ہے۔

اب تک جو سمجھا اس کے ایک حصے کو کتابی شکل میں سوچنے سمجھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا۔ تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے۔ یہاں حق کی تلاش کا سفر جاری رہتا ہے۔ تحقیق اور تفرقہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تحقیق میں افکار زیر بحث آتے ہیں اور ان کی چھان پھٹک کا کام ہوتا ہے۔ اس طرح افکار میں نکھار پیدا کرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ جبکہ تفرقہ میں اہمیت افراد کی ہوتی ہے۔ اس میں بحث ہمارے اور تمھارے حضرات کے حق اور ناحق ہونے میں ہوتی ہے۔ ہمارے حضرات کی جیت اور تمھارے حضرات کی ہار مطلوب ہوتی ہے۔ اس طریقہ بحث سے افکار میں انتشار اور افراد میں نفرت اور قوم میں عداوت پرورش پاتی ہے۔ ڈاکٹر غلام حیدر مگھرانہ نے تحقیق کا راستہ اختیار کر کے افکار میں نکھار پیدا کرنے کی کوشش کی جبکہ افراد ان کے نزدیک قابل احترام رہتے ہیں۔

"غیر سیاسی اسلامی تحریکیں" نام سے ڈاکٹر مگھرانہ نے چار اسلامی تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔ تبلیغی جماعت کے علاوہ باقی تینوں تحریکیں قیام پاکستان کے بعد وجود میں آئیں۔ تحریک ختم نبوت کو محترم ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۳ء سے شروع کیا۔ اگرچہ ان چاروں تحریکوں کا نقطہ آغاز قیام پاکستان سے پہلے ہے مگر ان کی آبیاری اور فروغ قیام پاکستان کے بعد ہوا۔

تنظیم اسلامی کو غیر سیاسی کہنا بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ تنظیم اسلامی کے سامنے منزل اسلامی انقلاب ہے۔ وہ مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کی اصطلاحات شہادت حق، اظہار دین اور اقامت دین کو اسی مفہوم میں سمجھتی اور سمجھاتی ہے۔ جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی میں فرق سیاسی اور غیر سیاسی

ہونے کا نہیں بلکہ پاکستان میں قائم نظام کو بدل کر اسلامی تعلیمات کے مطابق کرنے (جسے دونوں جماعتیں اسلامی انقلاب کہتی ہیں) کے طریقہ کار میں ہے۔

جماعت اسلامی انتخاب میں حصہ لے کر حکومت بنانے اور حکومت کے ذریعے اسلامی انقلاب برپا کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ جبکہ تنظیم اسلامی عوام میں اسلامی شعور پیدا کر کے ایک بہت بڑی تعداد کو اپنا ہمنوا بنا کر پر امن مظاہروں کے ذریعے حکومت کو اسلامی نظام قائم کرنے پر آمادہ یا مجبور کر کے اسلامی انقلاب برپا کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ ان دونوں جماعتوں کو اپنے اپنے طریقہ کار کے ذریعے کامیابی نہیں مل سکی جبکہ دونوں جماعیتں بڑے خلوص کے ساتھ اپنے اپنے طریقے پر عمل پیرا ہیں اور یقین رکھتی ہیں کہ راستہ یہیں سے نکلے گا۔

بڑھے چلو کہ منزل ابھی نہیں آئی

بہر حال بڑا دلچسپ مطالعہ ہے۔

تحریک ختم نبوت تمام مسلمانوں کی مجموعی جہدوجہد کا نام جسے 1974 میں کامیابی نصیب ہوئی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ دعویٰ نبوت کے جواب میں ختم نبوت کے عقیدے کو واضح کرنے کا نام ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کر کے اپنی ایک جماعت بنائی جسے پاکستان میں اچھا خاصا اثر و رسوخ حاصل ہوا۔ مسلمان اس تحریک سے متاثر ہوئے اور اس میں شامل ہونا شروع ہوئے۔ مرزا صاحب نے اپنی نبوت کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیا تو مسلمانوں نے ان کو اپنے سے جدا مذہب قرار دینے کی جہدوجہد کی جو بالآخر کامیاب ہوئی۔ اب مجلس ختم نبوت علمی میدان میں سر گرم عمل ہے۔

تبلیغی جماعت نے مذہب اسلام کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ان پڑھ میواتیوں میں اپنے کام کا آغاز کیا۔ مولانا الیاسؒ اس کے بانی تھے۔ بغیر جدید ذرائع اختیار کیے اس جماعت نے دنیا بھر میں اپنے کام کو پھیلایا اور تعارف حاصل کیا۔ اس جماعت کے بارے میں لٹریچر بہت کم ملتا ہے کیونکہ یہ عملی میدان میں مسلمانوں کی اصلاح کا کام کرتی ہے اور خوب کرتی ہے۔ مگر اس کو اسلام کی خدمت کے لیے مزید کیا کرنا چاہیے، اس پر ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں بحث کی ہے۔ دعوت اسلامی بھی تبلیغی جماعت ہی کے طرز پر کام کرنے والی جماعت ہے۔ اس کے بانی مولانا الیاس قادری ہیں۔ یہ بریلوی مکتبہ فکر کی نمائندہ جماعت ہے۔ سنتوں پر عمل کرنے کی ترغیب کے ذریعے مسلمانوں کو اسلام کے رنگ میں رنگ جانے پر

زور دیتی ہے۔ اس کی دلچسپ داستان آپ کو کتاب کے چوتھے باب میں ملے گی۔

ڈاکٹر گھرانہ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس اہم علمی کام کو انجام دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ علمی کام بہترین علمی نتائج پیدا کرے۔ محققین کے لیے تحقیق کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہو۔ اہل علم خالص علمی طریقہ سے اس کام کو آگے بڑھائیں اور نیک مقاصد کے حصول میں سبھی کام کرنے والے کامیاب ہوں۔

پروفیسر علی اصغر سلیمی
شعبہ علوم اسلامیہ
بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

پہلا باب: تنظیم اسلامی

پہلا باب: تنظیم اسلامی

بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد کا تعارف

ڈاکٹر اسرار احمد، ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع حصار، ہریانہ، بھارت میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۵ء۔ ۱۹۴۶ء میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے فعال کارکن اور جنرل سیکرٹری رہے۔

۱۹۴۷ء میں میٹرک کے امتحان میں ضلع حصار میں اوّل اور پنجاب یونیورسٹی میں مسلم طلباء میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ ہائی سکول کی تعلیم کے دوران ہی علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء) کی ولولہ انگیز ملی شاعری سے ذہنی و قلبی رشتہ استوار ہوا اور احیائے اسلام کے لیے عملی جدوجہد کی امنگ سینے میں پرورش پانے لگی۔

اکتوبر، نومبر ۱۹۴۷ء میں براستہ سلیمانکی قافلے کے ساتھ بیس دن پیدل سفر کر کے پاکستان آئے۔ ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف۔ ایس۔ سی

(میڈیکل) میں پنجاب یونیورسٹی میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا۔ ۱۹۶۰ء۔ ۱۹۶۱ء میں منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں حلقہ مطالعہ قرآن واسلامک ہاسٹل قائم کیا۔ ۱۹۶۲ء میں والدین کے ہمراہ پہلی بار حج کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۶۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا اور اواخر سال لاہور منتقل ہو کر کرشن نگر (حال اسلام پورہ) میں ذاتی مطب قائم کرنے کے ساتھ ساتھ مطالعہ قرآنِ حکیم کے متعدد حلقے قائم کیے۔ فروری ۱۹۷۱ء میں دوبارہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ اس موقع پر زندگی کا اہم ترین فیصلہ یعنی آئندہ میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر بقیہ زندگی ہمہ وقت دین کی خدمت میں وقف کرنے کا عزم کیا۔

۱۹۷۲ء میں تعلیمات وافکارِ قرآنی کے فروغ کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور کے علاقہ کرشن نگر میں قائم کی۔ بعد ازاں ۱۹۷۵ء میں تنظیمِ اسلامی کے نام سے غلبہ و اقامت دین کے لیے ایک قافلہ تشکیل دیا۔

۱۹۸۱ء میں جنرل ضیاء الحق (م:۱۷ اگست ۱۹۸۸ء) کی مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے مگر دو اجلاسوں میں شرکت کے بعد یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ ایک لاحاصل کام ہے، استعفیٰ دے کر علیحدگی اختیار کرلی۔ اپنی ایک تقریر میں ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ:

"لاہور کے گورنر ہاؤس میں میں نے ضیاء الحق سے یہ کہا کہ ایوب خان کے بنائے ہوئے عائلی قوانین غیر اسلامی ہیں لہٰذا انہیں تبدیل کر دیں۔ جنرل صاحب کا جواب یہ تھا کہ اگر میں نے عائلی قوانین کو تبدیل کر دیا تو پھر خواتین کا کیا بنے گا (یعنی خواتین پر جب قد غنیں لگیں گی تو ان کی طرف سے احتجاج ہو گا)۔ ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ یہ جواب سن کر میں نے انہیں استعفیٰ پیش کر دیا"[2]

ڈاکٹر اسرار احمد نے ۱۹۹۱ء میں "تحریک خلافت پاکستان" کی داغ بیل ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب کی دینی مساعی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے سب بھائی، بیٹے، بہوئیں، بیٹیاں، داماد اور متعدد دیگر قریبی عزیز و اقارب بھی تنظیم اسلامی میں شامل اور حسب توفیق سرگرم عمل ہیں[3]۔

جماعت اسلامی سے تعلق اور علیحدگی

ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی کتاب "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" میں جماعت اسلامی سے اپنے تعلق کی ابتدا اور علیحدگی کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جماعت اسلامی سے تعارف کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"پیدائش (اپریل ۱۹۳۲ء) سے میٹرک پاس کرنے تک (۱۹۴۷ء) کا زمانہ میں نے ضلع حصار مشرقی پنجاب میں گزارا۔ ظاہر بات ہے کہ جماعت اسلامی کا قیام اور اس کی زندگی کے اوّلین سال تو میری بالکل بے شعوری اور نا سمجھی کا زمانہ تھا۔ ۱۹۴۶ء۔ ۱۹۴۷ء میں جب کہ میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا، مسلمانان ہند کے اعصاب پر مسلم لیگ کی تحریک پورے طور پر مسلط تھی اور یہی اس کا تسلط کچھ سمجھ اور کچھ بے سمجھی کے ساتھ میرے دل و دماغ پر بھی تھا۔ تاہم اس زمانے میں ہی میرے کان میں جماعت اسلامی کی دعوت بھی پڑ چکی تھی۔

میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب اس زمانے میں جماعت کے لٹریچر کا بالاستیعاب مطالعہ کر رہے تھے۔ حصار سے لاہور آتے ہی یعنی قیام پاکستان کے فوراً بعد میں نے بھی جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ شروع کر دیا اور جماعت لاہور کے حلقہ کرشن نگر کے ساتھ عملاً وابستہ ہو گیا۔۔۔ لیکن میں جماعت کے ساتھ اپنے اس دور کے تعلق اور وابستگی کو بے شعوری کا تعلق اور وابستگی قرار دیتا ہوں۔ ایک عام کارکن

---

[2] ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام کا سماجی نظام، Peace TV، بمبئی انڈیا، ۲۰۰۴ء۔

[3] تنظیم اسلامی ایک نظر میں، ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۶ء، ص ۴۔۵۔

کی طرح اگر چہ میں بھی بھاگ دوڑ میں پوری طرح حصہ لیا کرتا تھا لیکن تحریک کے ساتھ میرا یہ تعلق سطحی تھا اور میں ابھی پوری طرح اسے سمجھ بھی نہ پایا تھا۔ تاہم اس بات کا احساس بھی مجھے جلد ہی ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۹ء کے اواخر میں، میں میڈیکل کالج میں داخل ہوا اور اس وقت سے میں نے جماعت اور تحریک کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا تو اپنے تعلق کا سطحی ہونا واضح ہوا اور جماعت کی دعوت اپنی پوری گہرائی کے ساتھ دل و دماغ پر منکشف ہوئی"[4]۔

ابتداء میں ڈاکٹر اسرار احمد کرشن نگر میں قائم جماعت اسلامی کے حلقہ کے ساتھ منسلک ہوئے اور دینی معاملات میں سرگرمی دکھائی تاہم میڈیکل کالج میں داخلے کے بعد اسلامی جمعیت طلبہ ☆ کے ساتھ منسلک ہو گئے جو جماعت کا طلبہ ونگ ہے۔ اپنی کتاب "مولانا مودودی مرحوم اور میں" میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:

"جیسے ہی میں نے ایف ایس سی پاس کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں ایم بی بی ایس کلاس میں داخلہ لیا میں نے اپنی رہائش بھی کالج کے ہاسٹل میں منتقل کر لی اور اس طرح اب میرا رابطہ جماعت اسلامی کی بجائے اسلامی جمعیت طلبہ سے قائم ہو گیا اور چونکہ مجھے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کا خاصا عملی تجربہ حاصل تھا، لہٰذا میں جمعیت

☆جماعت اسلامی کے بانی سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء) نے ۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو تعلیمی اداروں میں طلبہ کے اندر اسلامی روح پھونکنے کے لیے اسلامی جمعیت طلبہ کی بنیاد رکھی۔ ظفر اللہ خان (مقیم لاہور) اسلامی جمعیت طلبہ کے پہلے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے پلیٹ فارم پر تربیت حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر اسرار احمد، لیاقت بلوچ، سراج الحق جیسے افراد شامل ہیں۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاہور اسلامی جمعیت طلبہ کا گڑھ سمجھی جاتی ہے۔

میں ایک دم فعال اور سرگرم ہو گیا اور سال اول کے دوران ہی مجھے جمعیت لاہور کے حلقہ میڈیکل کالج کا ناظم بھی مقرر کر دیا گیا اور اکثر و بیشتر جمعیت کے اجتماعات میں درس قرآن کی ذمہ داری

---

[4]ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ، ناشر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، اشاعت ششم، نومبر ۲۰۰۵ء، ص ۳۷۔۳۸۔

بھی میرے ہی سپرد ہونے لگی"[5]۔

میڈیکل کالج کی نظامت سے لے کر پاکستان کی نظامت تک کا سفر ڈاکٹر اسرار احمد نے MBBS کی تعلیم کے لیے دوران طے کر لیا اور جیسے ہی میڈیکل کالج سے فارغ ہوئے جماعت اسلامی میں شمولیت کے لیے کمر کس لی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۵۴ء کے اکتوبر میں میں ایم بی بی ایس کا آخری امتحان پاس کر کے تعلیم سے فارغ ہوا۔ نتیجہ بر آمد ہوتے ہی پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت سے استعفاء دے دیا اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے بعد یعنی ۱۵ نومبر ۱۹۵۴ء کو میں نے جماعت اسلامی کی رکنیت☆ کی درخواست دے دی۔۔۔ درخواستِ رکنیت پیش کر دینے کے بعد ہی میں نے فوراً جماعت کے ارکان کی طرح اپنے آپ کو نظم کا پابند بنا کر کام شروع کر دیا۔۔۔ بہر حال فروری ۱۹۵۵ء میں میری درخواست رکنیت منظور ہو گئی"[6]۔

جماعت اسلامی ☆ کے بانی سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۷۹ء) کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد اپنی کتاب "مولانا مودودی مرحوم اور میں" میں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ قرآن حکیم کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:

"میرا قرآن حکیم کے مطالب و معانی سے پہلا تعارف سورۃ یوسف کی "تفہیم" کے ذریعے ہوا اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ اصلاً سورۃ یوسف کی اپنی چاشنی اور مٹھاس اور

☆جماعت اسلامی میں رُکن کا منصب انتہائی اہم ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جماعت میں شامل ہونے والا ہر فرد رُکن بھی بن سکے۔ جماعت اسلامی کی قیادت جب یہ اطمینان حاصل کر لیتی ہے کہ ایک فرد جماعت کے ڈسپلن کی مکمل طور پر پابندی کر رہا ہے اور اس نے نظریاتی اور عملی طور پر اپنے آپ کو اسلامی سانچے میں ڈھال لیا ہے تب اسے رُکن بنایا جاتا ہے۔ رُکن بننے کے بعد جماعت کے نظم سے انحراف کی صورت میں رُکنیت منسوخ بھی ہو سکتی ہے۔

پھر "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا" کے مصداق مولانا مودودی کے انداز تعبیر و تفہیم کو

---

5 ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا مودودی مرحوم اور میں، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، اشاعت سوم، نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۔ ۲۸۔

6 تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۴۳۔ ۴۵۔

میرے قرآنِ حکیم کے ساتھ آئندہ ربط و تعلق کی استواری میں اہم دخل حاصل ہے جس کے لیے میں مولانا مودودی کا تازیست ممنونِ احسان رہوں گا"[7]۔

مولانا مودودی کے ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد کی قربت کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

"اواخر ۱۹۵۱ء سے اواخر ۱۹۵۳ء تک، دو سال کا عرصہ میرے مولانا مودودی سے انتہائی قرب کا زمانہ ہے۔ جس کے دوران مجھ پر مولانا کی بزرگانہ شفقتیں اور مربیانہ عنایتیں اس حد کو پہنچ گئیں کہ عمر اور مقام و مرتبے کے "بعد المشرقین" کے علی الرغم بے تکلفی کا عالم یہ ہو گیا کہ "باہمی" گفتگو میں طنز و مزاح کا استعمال بھی "دو طرفہ" ہونے لگا"[8]

اسلامی جمعیت طلبہ کے زیر انتظام ۱۹۵۱ء میں لاہور میں ایک تربیتی کورس کا اہتمام کیا گیا۔ اس تربیت گاہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"تربیت گاہ کے آخری دن ہم نے جملہ اساتذہ اور مربی حضرات کے لیے دعوت طعام کا اہتمام کیا۔ تو جب میں نے مولانا مودودی سے اس کا ذکر کیا اور انہیں شرکت کی دعوت دی تو انہوں نے فرمایا: "اچھا۔ لیکن پھر میں بھی کوئی چیز لے کر آؤں گا" اس پر میں نے بلا جھجک کہا کہ "اگر یہ بات ہے تو پھر ہم لوگ مرغی پکا رہے ہیں، آپ بھی کوئی مقابلے کی چیز لے کر آئیے گا!" اگرچہ مولانا نے مجھے اس کا یہ "بھرپور" جواب دے کر محفل کو زعفران زار بنا دیا کہ "مرغی کے مقابلے کی چیز تو بلی ہے!""[9]۔

گذشتہ سطور اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ پھر یہ کیا وجہ ہے کہ انہوں نے اپریل ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفاء دے دیا؟ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی دو کتابوں "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" اور "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب" جو کہ پہلی کتاب کا تتمہ ہے، میں اس سوال کا مفصل جواب دیتے ہیں۔

---

[7] مولانا مودودی مرحوم اور میں، ص ۲۵

[8] حوالہ سابق، ص ۲۹۔۳۰

[9] حوالہ سابق، ص ۳۱

۱۵ نومبر ۱۹۵۴ء کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لیے درخواست دیتے وقت ڈاکٹر اسرار احمد نے جماعت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھا:

"میں یہ سمجھتا ہوں کہ پوری دنیا میں خالص تحریک اسلامی تو محض جماعت اسلامی ہے (پاکستان کی بھی اور ہندوستان کی بھی) البتہ دینی مقاصد کے لیے اور اچھے کام کرنے والے اور ادارے بھی ہیں اور جماعتیں بھی ہیں۔ پاکستان میں بھی اور باقی دنیا میں بھی۔ ان اداروں یا جماعتوں نے مجھے اس حد تک تو متاثر کیا ہے لیکن جماعت اسلامی کے سوا کسی اور ادارے یا جماعت کے مقصد اور طریق کار کو میں خالصتہً اسلامی اور ٹھیٹھ دینی نہیں سمجھتا"[10]۔

جماعت اسلامی کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کا مندرجہ بالا نقطہ نظر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور فروری ۱۹۵۵ء میں درخواست رکنیت کی منظوری کے چند ماہ بعد ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اگر جماعت اسلامی اپنی موجودہ پالیسی پر گامزن رہتی ہے تو ان کے لیے جماعت کے ساتھ چلنا مشکل ہو گا۔

نومبر ۱۹۵۵ء کے کل پاکستان اجتماع منعقدہ کراچی کے موقع پر ایک جائزہ کمیٹی بنائی گئی تاکہ جماعت کی پالیسیوں سے اختلاف رکھنے والوں سے ملاقاتیں کی جائیں۔

یہ مجلس ابتداً آٹھ ارکان پر مشتمل تھی لیکن چند ماہ بعد اس کو مختصر کر دیا گیا اور حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب (م: ۲۸ جون ۱۹۹۶ء) کی سرکردگی میں ان کے علاوہ مرکزی مجلس شوریٰ کے تین اور بزرگ اراکین یعنی مولانا عبد الجبار غازی، مولانا عبد الغفار حسن (م: ۲۲ مارچ ۲۰۰۷ء) اور جناب شیخ سلطان احمد صاحب پر مشتمل اس جائزہ کمیٹی نے تقریباً آٹھ ماہ کے عرصہ میں پورے پاکستان کا دورہ کر کے اپنے فرائض مفوضہ کو ادا کیا۔

۳۰ ستمبر ۱۹۵۶ء کو بمقام اوکاڑہ ڈاکٹر اسرار احمد نے جائزہ کمیٹی سے ملاقات کی اور اواخر اکتوبر میں اپنے خیالات کو ایک مفصل بیان کی شکل میں قلم بند کر کے مولانا عبد الرحیم اشرف کنوینر جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اپنے بیان میں ڈاکٹر اسرار احمد نے اس بات پر زور دیا کہ:

"پالیسی اور طریقہ کار کے اعتبار سے تقسیم برصغیر سے ما قبل اور اس کے مابعد کی جماعت میں

---

10 ڈاکٹر اسرار احمد، تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، سن اشاعت بار سوم، نومبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۶۶۔۱۶۷۔

واضح تفاوت و اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے اور جب کہ قبل از تقسیم کی جماعت ایک خالص اور ٹھیٹھ اسلامی تحریک کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ وہاں بعد از تقسیم کی جماعت ایک ایسی قومی، سیاسی جماعت بن گئی ہے جس میں دین کا داعیہ چاہے کم یا زیادہ موجود ہو، خالص اسلامی تحریک کی خصوصیات موجود نہیں ہیں"[11]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے جائزہ کمیٹی کے سامنے جو بیان دیا وہ انہوں نے اپنی کتاب "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" میں من و عن درج کر دیا ہے۔ اس بیان میں انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے کی جماعت اسلامی اور قیام پاکستان کے بعد کی جماعت میں تقابل کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی راہ صواب سے ہٹ گئی ہے۔ ذیل میں ڈاکٹر صاحب کے بیان کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

تحریک جماعت اسلامی کا دور اول

۱۔ قیام پاکستان سے قبل کی جماعت اسلامی کی سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے "ظاہری اسلام" اور "حقیقی اسلام" اور "نسلی مسلمان" اور "اصلی مسلمان" میں فرق اور امتیاز قائم کیا۔ اور مسلمانوں کو حقیقی اسلام کو شعوری طور پر اختیار کرنے اور اصلی مسلمان بننے کی دعوت دی۔

۲۔ دوسری بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ تحریک اسلامی نے اپنی دعوت اور اپیل کو مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے غیر مسلموں تک عام کر دیا۔

۳۔ متذکرہ صدر دو خصوصیات کی بنا پر جماعت اسلامی "مسلمانوں کی ایک قومی جماعت" بننے کے بجائے ایک "اصولی اسلامی جماعت" بنی۔ جس کا مقصد وحید اسلام کی سربلندی اور اس کا بول بالا کرنا تھا اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ اسلام اس "قوم" کا مذہب تھا کہ جس کا وہ بھی ایک جزو تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کی نگاہ میں وہی "حق" تھا اور اسی میں پوری نوع انسانی کی دنیوی اور اخروی فلاح تھی۔

۴۔ قوم پرستانہ نصب العین کو چھوڑ کر جماعت اسلامی نے جو نصب العین اختیار کیا اور جسے قبول اور اختیار کرنے کی دعوت اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو دی وہ "حکومت الٰہیہ" کا قیام ہے۔

---

11 حوالہ سابق، ص ۱۶۷

۵۔ جماعت اسلامی میں شامل ہونے والے اپنے آپ کو نو مسلم سمجھتے اور اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیتے۔

٦۔ اس دور میں جماعت اسلامی کو ”رائے عامہ“ کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔ اس کے پاس ترک و اختیار اور ردو قبول کا صرف ایک معیار تھا اور وہ یہ کہ ”حق“ کیا ہے اور ”ناحق“ کیا۔

۷۔ جماعت کے کام میں تقدیم و تاخیر کی ترتیب یہ تھی۔

(i) سب سے مقدم اور سب سے اہم: ذہنی فکری اور علمی انقلاب

(ii) اس کے بعد: عملی و اخلاقی تبدیلی

(iii) اور موخر ترین: رفاہ عامہ اور خدمت کے کام

دور ثانی:

(i) اس دور کے طریق کار کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ اس میں ”نسلی“ اور ”اصلی“ اور ”ظاہری“ اور ”حقیقی“ اسلام کی تمیز ترک کر کے لوگوں کے ظاہری اسلام کو بطور اصل موضوعہ تسلیم کر کے استدلال شروع کیا گیا۔

(ii) ساتھ ہی اس تحریک کی اپیل اور دعوت غیر مسلموں کے لیے ختم ہو گئی۔

(iii) مندرجہ بالا دو خصوصیات کی بنا پر جماعت اسلامی ایک قومی جماعت بن گئی۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک دور ثانی میں جماعت کی پالیسی میں یہ تبدیلی اس وجہ سے ہوئی کہ جماعت عجلت پسندی کا شکار ہو گئی۔ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں کچھ اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ تحریک اسلامی کے لیے ایک بظاہر آسان اور مختصر راستہ دفعتاً نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس آسان اور مختصر راستے کے سامنے آنے کے لیے دو پہلو درج ذیل ہیں۔

(i) ایک یہ کہ قیادت کے میدان میں ایک خلا نظر آ رہا تھا۔

(ii) دوسرے یہ کہ ایک نئی مملکت بنی تھی، جس کا دستور ابھی بننا تھا اور اس کو ابتدا ہی میں صحیح بنیادوں پر بنوا لینا بعد میں اس کو بدلوا کر صحیح کرنے سے زیادہ آسان نظر آتا تھا۔

اس پر اضافہ کچھ اور امور سے ہو گیا، جن میں سب سے اہم یہ کہ مغربی پاکستان سے ایک بہت

بڑے پیمانے پر غیر مسلموں کا انخلا ہوا اور اس وسیع خطہ ارضی میں مسلمان ہی مسلمان رہ گئے۔ اس سے یہ راہ اور بھی آسان نظر آنے لگی اور محسوس ہوا کہ اسلام کی راہ کی ایک بہت بڑی رکاوٹ اللہ تعالیٰ نے راستے سے ہٹا دی ہے۔۔۔ لہٰذا بڑھو اور اس Short Cut سے اقتدار ہاتھ میں لے کر نیچے سے اوپر کی طرف ایک فطری طریقہ پر انقلاب لانے کا کھکھیڑ مول لینے کی بجائے اوپر سے نیچے کی طرف انقلاب لانے کا ایک موقع جو مل رہا ہے، اس سے فائدہ اٹھالو"[12]۔

ڈاکٹر اسرار احمد مزید کہتے ہیں:

"اسے غلطی میں ضرور سمجھتا ہوں لیکن اس غلطی کو میں جذبہ عجلت پسندی پر محمول کرتا ہوں، کسی بری نیت یا ارادے پر مبنی نہیں سمجھتا"[13]۔

جائزہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ تقریباً ایک سال کی محنت و مشقت کے بعد وسط نومبر ۱۹۵۶ء میں پیش کی اور اس پر غور کرنے کے لیے مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ۲۵ نومبر کو شروع ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اسرار احمد کی آراء کو اہمیت نہ دی گئی اور ایک قرار داد پاس کی گئی جس میں یہ الفاظ درج تھے:

"جماعت نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد اب تک جو کام کیا ہے اس کے متعلق مجلس شوریٰ اس بات پر مطمئن ہے کہ جماعت اپنے اصول، مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے"[14]۔

نومبر ۱۹۵۶ء سے لے کر فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان کے اختتام تک جماعت ایک شدید بحران سے گزری اور اجتماع ماچھی گوٹھ کے دو ماہ بعد ڈاکٹر اسرار احمد نے جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ واضح رہے کہ اس بحران میں جماعت اسلامی کے اور بھی کئی سرکردہ رہنما جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

مولانا مودودیؒ کا نقطہ نظر

یہاں پر یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کی پالیسی میں

---

12 تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔

13 حوالہ سابق، ص ۲۲۰، ۲۲۱۔

14 حوالہ سابق، ص ۲۲۶۔

جو تبدیلی آئی اس کے بارے میں جماعت اسلامی کے اس وقت کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا موقف معلوم کیا جائے۔ "جماعت اسلامی، اس کی تاریخ، مقصد اور لائحہ عمل" میں مولانا مودودیؒ نے ان دلائل کو جمع کر دیا ہے کہ جن کی بنا پر ان کی رائے میں قیام پاکستان کے وقت جماعت کے طریقہ کار میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی تھی۔ اس پوری بحث اور اس میں اختیار کردہ استدلال کا خلاصہ حسب ذیل تین نکات ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کا انفرادی اور اجتماعی اخلاق انتہائی دگر گوں حالت میں تھا۔ ان میں "صبر، ضبط، نظم، باقاعدگی، محنت، تعاون اور وحدت و اخوت" کے وہ اوصاف موجود نہ تھے "جو ایک کامیاب اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہیں"۔ لہٰذا ناگزیر تھا کہ اس مسلمان قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کی جاتی۔

۲۔ "۱۹۴۷ء کا سیاسی انقلاب ہماری نگاہ میں ایک مصنوعی انقلاب تھا"۔۔۔ اور "پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے جو اب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے، ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی الجھی الجھی متضاد باتیں کرنی شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی، اسے دیکھ کر صاف معلوم ہو گیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھ میں ہیں"۔۔۔ اور "یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے۔ اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کیے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے وہ یکایک کسی غلط نظریے کو اس مملکت کی بنیاد قرار دے بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالت کی بہ نسبت ہزار گناہ زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے!"

۳۔ "خوش قسمتی سے اس زمانے میں متعدد آزمائشیں ایسی پیش آگئیں جن سے یہ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا کہ ہماری جماعت اپنی اخلاقی تربیت اور اپنے نظم کے اعتبار سے اس وقت فی الواقع کتنی طاقت رکھتی ہے اور آگے کے مراحل میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے"۔

جہاں تک مولانا مودودیؒ کے پہلے استدلال کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں میں وہ ساری خرابیاں موجود تھیں جن کا مولانا کو احساس ہوا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ اگر جماعت قومی رنگ اختیار نہ کرتی تو کیا مسلمانوں کی اصلاح کا کام نہیں ہو سکتا تھا؟ یقینا ہو سکتا تھا اور ہماری رائے میں یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے ہونا تھا۔ کیونکہ ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے جماعت اسلامی کا قومی سیاست سے نفرت کا طریقہ محو نہیں ہوا تھا۔ جونہی جماعت نے اپنے اصول کو بدلا، قوم متنفر ہو گئی۔

دوسری دلیل جماعت کے حلقوں میں بے حد عام ہے۔ اس دلیل کے اصل میں دو جزو ہیں یعنی یہ کہ اگر اس وقت یہاں ایک غیر اسلامی دستور کو نافذ ہونے دیا گیا تو پھر اس دستور کو بدل کر اسلامی دستور کا نافذ کرانا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ جب ایک غیر اسلامی دستور کو ہم تسلیم نہ کریں گے تو ہماری پوزیشن مملکت کے باغیوں کی سی ہو جائے گی اور ہمارا اصل مقام پھانسی کے تختے اور جیلوں کی کال کوٹھڑیاں ہوں گی۔

جہاں تک پہلے جذو کا تعلق ہے اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ایک غیر اسلامی دستور کو بدلوانا خاصا مشکل ہے لیکن دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب بھی انقلابی تحریکیں بر سر کار آئی ہیں اور انہوں نے اپنا خون اور پسینہ بہا کر وقت کے نظام کو بدلنے کی سعی کی ہے تو آج تک کبھی دستور کے عارضی پرزے تو دور رہے بڑے بڑے جابر اور قاہر شہنشاہوں کا جبر و قہر بھی ان کا راستہ نہیں روک سکا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انقلابی طاقتوں کے خلوص کو مصائب و مشکلات اور ابتلاو آزمائش کی کسوٹی پر پرکھا ضرور جاتا ہے۔ جہاں تک دلیل کے دوسرے پہلو کا تعلق ہے تو وہ ایک بزدلانہ موقف ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴ء۔۱۹۹۷ء) نے راہ حق کی مشکلات کو ایک جگہ 'اعوان و انصار' کا درجہ دیا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کسی راہ کے اعوان انصار سے خوف کھا کر راہ ہی بدل دی جائے۔

تیسری بات اپنی جگہ خوشنما تو بہت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس سے ثابت کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ مان لیا کہ آپ کے ارکان کی اخلاقی اور دینی حالت کی آزمائش ہو گئی تھی لیکن نتیجتاً صرف یہی تو ظاہر ہوا کہ اب تک جو کچھ کام آپ نے کیا وہ صحیح نہج پر تھا اور بارآور ہوا ہے۔ آگے اطمینان سے پیش قدمی جاری رکھیے۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ آپ اپنے کام کی نوعیت ہی بدل ڈالیں۔ اس کی مثال تو ایسے ہے کہ ایک بچے کا پرائمری کا امتحان لیا جائے اور وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو پھر اسے فوراً کالج میں لا بٹھایا جائے اور استدلال یہ کیا جائے کہ جناب یہ امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا۔

تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر

تنظیم اسلامی کا نام سب سے پہلے اس اجتماع میں سامنے آیا جو ۸۔۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو رحیم یار خاں میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع کا انعقاد ڈاکٹر اسرار احمد کی مساعی کا نتیجہ تھا۔

جو لوگ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے ان میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبد الغفار

حسن اور حکیم عبد الرحیم اشرف [مقیم لائلپور حال فیصل آباد] نے بھرپور کوشش کی کہ کوئی نئی ہیت تنظیمی فوری طور پر وجود میں آجائے۔ ان کی اس کوشش میں جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے ان عام ارکان کی اکثریت بھی شریک تھی جو معتدبہ تعداد میں لاہور، فیصل آباد اور ساہیوال سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن یہ مساعی ناکام رہیں اور جماعت کے سابق ارکان پر مشتمل کوئی نئی اجتماعیت وجود میں نہ آسکی جس کے نتیجے میں بقول ڈاکٹر اسرار احمد "ایک عمومی مایوسی اور بددلی اس پورے حلقے میں پھیل گئی"[15]

ڈاکٹر اسرار احمد نے لوگوں کو مایوسی نکالنے کے لیے اپنی مساعی جاری رکھیں اور حکیم عبد الرحیم اشرف کے تعاون سے سابقین جماعت اسلامی کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب محسوس ہوا کہ حکیم صاحب کچھ زیادہ ہی مایوس اور بددل ہوگئے ہیں تو ڈاکٹر اسرار احمد نے ذاتی تحریک اور منٹگمری (حال ساہیوال) کے احباب کے تعاون سے ایک بھرپور مشاورتی اجتماع کا اہتمام کیا جو عزیز ٹیریز، ہڑپہ میں منعقد ہوا اور کئی روز تک جاری رہا لیکن یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ نتیجتاً مایوسی کے سائے مزید گہرے ہو گئے اور ۱۹۶۰ء۔۱۹۶۱ء کے لگ بھگ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابر اور عام ارکان کے حلقے میں کسی نئی تعمیر و تشکیل کے ضمن میں کسی عملی سعی وجہد تو کجا، مستقبل قریب میں اس کی کسی امید کے آثار بھی باقی نہ رہے۔ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور ۱۹۶۶ء میں مولانا عبد الغفار حسن کے ساتھ مل کر نہ صرف کراچی اور لاہور بلکہ بعض دوسرے مقامات پر بھی سابق ارکان جماعت کو ایک نئی تنظیم کے قیام پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ان مساعی کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں قیام اجتماعیت کی وہ چنگاری جو خاکستر کی موٹی تہہ میں دب چکی تھی دوبارہ پورے آب وتاب کے ساتھ بھڑک اٹھی۔

مولانا عبد الغفار حسن نے چونکہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ملازمت اختیار کی ہوئی تھی اس لیے وہ واپس مدینہ منورہ چلے گئے اور ان کی عدم موجودگی میں شیخ سلطان احمد نے ان کی نیابت کا حق بخوبی ادا کیا اور اپنی شدید خانگی اور کاروباری مصروفیات کے علی الرغم ایک رفیق (ڈاکٹر اسرار احمد) کی معیت میں پاکستان کے متعدد اہم مقامات کے سفر کی صعوبت جھیل کر اس تحریک کے پودے کو پروان چڑھایا۔ نتیجتاً جون ۱۹۶۷ء میں ضلع رحیم یار خان میں سردار محمد اجمل خان لغاری (م: مارچ ۱۹۸۸ء) کی رہائش گاہ

---

[15] ڈاکٹر اسرار احمد، تعارف تنظیمِ اسلامی، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، اشاعت ہفتم، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۵۔

پر شیخ سلطان احمد، سردار محمد اجمل خان لغاری اور ڈاکٹر اسرار احمد نے طویل گفت وشنید اور بحث و تمحیص کے بعد ایک قرارداد پر دستخط ثبت کیے جو جولائی ۱۹۶۷ء کے ماہنامہ میثاق میں ''قراردادِ رحیم آباد'' کے نام سے شائع ہوئی۔

قراردادِ رحیم آباد

اس قرارداد کا متن ڈاکٹر اسرار احمد نے تیار کیا۔ اس قرارداد کے ذریعے ایک نئ جماعت کے قیام کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ چنانچہ ایک جگہ یہ لکھا گیا کہ:

''ہم یہ طے کرتے ہیں کہ ایک ایسی اجتماعیت کا قیام عمل میں لایا جائے جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد ومعاون ہو''[16]۔

درحقیقت ڈاکٹر اسرار احمد، سردار اجمل خان لغاری اور دیگر افراد جن میں مولانا امین احسن اصلاحی اور شیخ سلطان احمد بھی شامل تھے، کا ارادہ یہ تھا کہ جماعت اسلامی سے جو لوگ علیحدہ ہوئے ہیں، انہیں نئے نظم میں شامل کیا جائے۔ اجتماعیت کی نوعیت کیسی ہونی چاہیے؟ نیز افراد کی تربیت کے حوالے سے نئ جماعت کیا راہیں متعین کرے گی؟ اس قرارداد میں اس کا تفصیلی ذکر کیا گیا۔ چنانچہ یہ لکھا گیا کہ:

''پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کما حقہ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔۔۔۔ عملی زندگی میں حلال وحرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے''[17]۔

دعوت کے طریقہ کار کے ضمن میں اس بات پر زور دیا گیا کہ تدریج کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے اور جاہلیت قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلّل ابطال کیا جائے۔

لوگوں سے رابطہ کرنے اور نئ جماعت کی تشکیل کرنے کے لیے شیخ سلطان احمد کو ذمہ دار بنایا گیا۔ اس قرارداد میں جس قدر جوش وجذبے کا مظاہرہ کیا گیا، بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہ صرف

---

16 حوالہ سابق، ص۷۔

17 حوالہ سابق، ص۲۶۔

زبانی جمع خرچ تھا۔ عملی طور پر کوئی بڑا قدم نہ اٹھایا گیا۔

قرارداد رحیم آباد کی چند ترامیم کے ساتھ توثیق:

رحیم یار خان میں 7-6 ستمبر کو مجلس مشاورت کا اجتماع ہوا اور بعد ازاں ۸۔۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو کھلے اجلاس ہوئے جن میں اوّلاً ڈاکٹر اسرار احمد نے مجوزہ قرارداد اور اس کی توضیحات پڑھ کر سنائیں۔ پھر مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبد الغفار حسن نے مزید تائیدی اور توضیحی تقریریں کی۔

تقریر مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا نے اپنی تقریر کے دوران بیشتر وقت قرارداد کی وضاحت پر صرف کیا اور سامعین کے سامنے یہ بات واضح کی کہ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس کو صرف دین کی عائد کردہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں ممد و معاون سمجھنا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دین کو اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں پر ہمیں حاوی کر لینا چاہیے۔ دین کی دعوت دینے پر انہوں نے بطور خاص گفتگو کی اور کہا:

”یہ دوسروں کو دعوت دینا بھی ہماری فطرت بشری کا اقتضا اور ہماری اپنی اصلاح اور ترقی کا لازمہ ہے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ انسان تنہا نہیں پایا جاتا وہ ایک مدنی الطبع ہستی ہے، وہ کسی خاندان کے فرد، کسی قبیلہ کے رکن، کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لیے وہ ان سب باتوں کا محتاج ہے۔ اسی بناء پر انسان کو Social Animal کہا گیا ہے“[18]۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے مختلف مثالوں کے ذریعے یہ وضاحت کی کہ انسان اپنے ماحول سے بے حد متاثر ہوتا ہے اس لیے دعوت کا عمل انتہائی ضروری ہے۔

تقریر مولانا عبد الغفار حسن

مولانا نے اپنی تقریر کے دوران نئی دینی تنظیم کے خصائص پیش کیے اور کہا کہ:

”پہلی خصوصیت ہماری پیش نظر تنظیم کی یہ ہے کہ اس میں نصب العین کے مقام پر صرف

[18] حوالہ سابق، ص ۴۰۔

نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کو رکھا گیا ہے۔ دوسری خصوصیت ہماری تنظیم کی یہ ہو گی کہ ہماری دعوت صرف اللہ اور اس کے دین کی طرف ہو گی نہ کسی خاص شخصیت یا جماعت کی طرف ہو گی، نہ کسی خاص مسلک یا فقہی مذہب کی طرف"[19]۔

مولانا عبد الغفار حسن نے اپنی تقریر کے دوران یہ بھی واضح کیا کہ اس تنظیم کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ غیر مسلموں تک بھی دین کا پیغام پہنچایا جائے گا۔ انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ نئی قائم ہونے والی تنظیم میں اس اصول کو متعین کر لیں کہ صرف انہیں اوراد و وظائف اور اذکار و ادعیہ کو اختیار کریں جو خدا کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ماخوذ ہوں کیونکہ اس سے ایک تو افتراق و انتشار میں کمی ہو گی اور دوسرا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو گا۔

مولانا اصلاحی اور مولانا عبد الغفار حسن کے خطابات نہ صرف فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہیں بلکہ تنظیمی زندگی کے لیے معلومات و ہدایت کا بھی گنجینہ ہیں۔ لیکن عملاً کیا ہوا؟ کیا ان حضرات نے خود بھی تنظیمی زندگی اختیار کی؟ یہ ایک تکلیف دہ سوال ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ تقاریر کے بعد شرکاء اجتماع کی جانب سے بعض لفظی ترامیم بھی پیش ہوئیں اور بالآخر قرارداد کو مع توضیحات منظور کر لیا گیا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ قرارداد رحیم آباد کے ابتدائی تین پیروں کی بجائے یہ پیرا شامل کیا گیا:

"آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو"[20]۔

ترمیم شدہ قرارداد میں یہ بھی طے کیا گیا کہ سات افراد پر مشتمل مجلس مشاورت عملی جدوجہد کے آغاز کے لیے پروگرام ترتیب دے۔ ان سات افراد میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبد الغفار حسن، مولانا عبد الحق جامعی (م: ۱۹۸۵ء)، شیخ سلطان احمد، سردار محمد اجمل خان لغاری، ڈاکٹر محمد نزیر مسلم (م: ۱۹۹۰ء) اور ڈاکٹر اسرار احمد شامل تھے۔ ماہنامہ میثاق کی ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء کی مشترکہ اشاعت

---

[19] حوالہ سابق، ص ۵۲، ۵۳۔

[20] حوالہ سابق، ص ۸۔

میں ترمیم شدہ قرارداد اور توضیحات بھی شائع کر دی گئیں اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبد الغفار حسن کی تقاریر بھی، مزید بر آں صرف قرارداد اور اس کی توضیحات کو "ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ" کے عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تاکہ اسے زیادہ وسیع حلقے تک پہنچایا جا سکے۔

سابقینِ جماعت اسلامی کی کنارہ کشی

رحیم یار خان میں قائم کردہ مجلس مشاورت کے ارکان نے اگرچہ کچھ عرصہ تک تو جوش و خروش کا مظاہرہ کیا لیکن آہستہ آہستہ اہم رفقاکے مزاج میں تکدر پیدا ہو گیا اور بعض حوادث رونما ہوئے جن کے نتیجے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی طبیعت بجھ کر رہ گئی۔ ایک حادثہ جس کا ذکر ڈاکٹر اسرار احمد کرتے ہیں کچھ یوں ہے:

"رحیم آباد میں یہ طے ہوا تھا کہ جماعت اسلامی پر تنقید نہیں کی جائے گی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد حیدرآباد سندھ میں مولانا وصی مظہر ندوی (م:۲۰۰۶ء) کی دعوت پر ایک جلسے میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جماعت اسلامی پر شدید تنقید کی جس کی وجہ سے ان کے (یعنی ڈاکٹر اسرار احمد کے) اور مولانا امین احسن اصلاحی کے درمیان فاصلے بڑھ گئے"[21]۔

چنانچہ جماعت اسلامی کے ساتھ سابق تعلق کی قدر مشترک کی اساس پر نئی تنظیم کے قیام کی کوششیں ختم ہو گئیں۔ سوائے ڈاکٹر اسرار احمد کے کسی نے بھی کمر ہمت نہ کسی۔ اگر ڈاکٹر اسرار احمد بھی نئی جماعت کے قیام کے لیے سنجیدگی کے ساتھ قدم نہ اٹھاتے تو نقادیہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ ڈاکٹر اسرار احمد دین کے ساتھ مخلص نہیں۔ لیکن مستقبل کے حالات نے یہ بات ثابت کر دی کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے جس بات کو حق سمجھا اس پر عمل بھی کیا اور اگر سابقین جماعت اسلامی نے ان کا ساتھ نہیں دیا تو وہ پھر بھی مایوس نہیں ہوئے اور انہیں افکار کی بنیاد پر ایک جماعت بنانے میں کامیاب ہوئے جن افکار کا تذکرہ مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبد الغفار حسن نے اپنی تقاریر رحیم آباد میں کیا تھا۔

تنظیم اسلامی کی تشکیل

جب ڈاکٹر اسرار احمد کو مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبد الغفار حسن کی جانب سے حوصلہ

[21] رحمت اللہ بٹر، انٹرویو (غیر مطبوعہ)، ناظم دعوت تنظیم اسلامی، پاکستان، جون ۲۰۰۷ء۔

افزا جواب نہ ملا تو انہوں نے ایک اصولی اسلامی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

لاہور میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن اور ”دارالاشاعت اسلامیہ“ کا قیام اور ماہنامہ ’میثاق‘ کا دوبارہ اجراء پہلے ہی عمل میں آ چکا تھا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم کے انقلابی فکر اور ولولہ انگیز دعوت کی اساس پر ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ وجود میں آ چکا تھا جو فطری تدریج کے ساتھ مسلسل ترقی کر رہا تھا جس کے نتیجے میں اولاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ۲۱ جولائی ۱۹۷۴ء کی شام کو اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ آئندہ معاملہ صرف قرآن کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم تک محدود نہیں رہے گا اور صرف ”انجمن“ پر اکتفا نہیں ہو گی بلکہ اقامت دین کی اجتماعی جدوجہد کے لیے ایک باضابطہ ”جماعت“ کا قیام عمل میں لایا جائے گا[22]۔

گویا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھیوں کو تیار کر رہے تھے کہ وہ ایک جماعت کے قیام کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ اپنی دعوت کے کام کو پھیلانے کے لیے انبیاء بھی لوگوں کے اذہان تیار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے لیے قرآن مجید میں تدریج کا یہی طریقہ اختیار کیا[23]۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے دروس قرآن کا سلسلہ شروع ہی اس لیے کیا تھا کہ ایسی افرادی قوت میسر آ جائے جو دین اسلام کے غلبے کے لیے ان کا ساتھ دے سکے۔

قرارداد رحیم آباد کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کا نقطہ نظر:

قرارداد رحیم آباد میں ڈاکٹر اسرار احمد اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”انہیں اس وقت بھی یہ احساس تھا کہ اس میں اقامت دین کا تصور کچھ دب گیا ہے اور اس کی اہمیت کما حقہ واضح نہیں ہو رہی اور اگرچہ دین کی اقامت کی اصطلاح اس میں موجود ہے تاہم بحیثیت مجموعی اس سے اصلاً ایک تبلیغی اور اصلاحی تحریک کا نقشہ سامنے آتا ہے“[24]۔

ڈاکٹر صاحب اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی تحریک کی قلب ماہیت اور

---

[22] تعارف تنظیم اسلامی، ص ۱۰۔

[23] البقرہ:۲۱۹، النساء:۴۳، المائدۃ:۹۰۔

[24] تعارف تنظیم اسلامی، ص ۱۰۔

ایک اسلامی انقلابی جماعت کی بجائے اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کا انداز اختیار کر لینے اور اس کے نتیجے میں اس کے کارکنوں کے مزاج میں سیاسی رنگ کے غلبے نے سابقین جماعت کے حلقے میں ردِ عمل کے طور پر "دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے"!اور "سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے"! کے مطابق "انقلاب" کے لفظ سے وحشت پیدا کر دی تھی[25]۔

قرار داد رحیم آباد کے بارے میں اپنے تحفظات کے باوجود یہ بات قابل حیرت ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے نئی جماعت کی تشکیل کے لیے قرارداد تاسیس کے طور پر اسی کو اختیار کیا۔ شاید ان کی یہ خواہش تھی کہ ۱۹۶۷ء میں رحیم آباد میں اکٹھے ہونے والے تمام احباب نئی جماعت میں شامل ہو جائیں۔ لیکن ان کا یہ عمل حقیقت پسندانہ محسوس نہیں ہوتا کیونکہ ایک ایسی قرارداد جس سے بقول ڈاکٹر اسرار احمد ایک اصلاحی اور تبلیغی تحریک کا نقشہ سامنے آتا ہے، کی بنیاد پر ایک اسلامی انقلابی جماعت قائم کرنا نہ صرف موجب حیرت ہے بلکہ باعث تعجب بھی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے محولہ بالا اقتباس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ۱۹۵۷۔۵۸ء میں جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے افراد نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جماعت اسلامی نے ایک اسلامی انقلابی جماعت کی بجائے ایک قومی سیاسی جماعت کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ سے بہت سے افراد بشمول ڈاکٹر اسرار احمد ۱۹۵۷۔۵۸ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک جماعت کا انتخابات میں حصہ لینا بہت بڑی غلطی تھی۔

تاسیسی اجلاس

تنظیم اسلامی کا تاسیسی اجلاس ۲۷ اور ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر واقع ۱۲۔ اے، افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں لاہور کے علاوہ کراچی، سکھر، بہاول پور، ساہیوال، فیصل آباد، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور بعض دوسرے مقامات سے کل ایک سو تین افراد شریک ہوئے۔ ان میں جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے افراد میں سے کوئی معروف آدمی نہیں تھا۔ سوائے شیخ جمیل الرحمن کے، کہ وہ کراچی کی جماعت کے معروف اور نمایاں لوگوں میں شامل رہے تھے۔ گویا یہ پورا قافلہ ڈاکٹر اسرار احمد کی دعوت قرآنی کے نتیجے میں عالم وجود میں

[25] حوالہ سابق، ص ۱۱۔

آیا تھا اور اس کے جملہ اساسی تصورات مطالعہ قرآنِ حکیم کے اس منتخب نصاب پر مبنی تھے جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنی دعوت قرآن کا مرکز و محور بنایا تھا۔

یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کے اس منتخب نصاب کی وضاحت کر دی جائے جسے ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی دعوت کا ذریعہ بنایا۔

قرآنِ مجید کا منتخب نصاب

ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی فکر کو عام کرنے کے لیے درس قرآن کے حلقے قائم کیے اور ان حلقوں میں قرآنِ مجید کی مخصوص آیات اور سورتوں کے درس دیئے۔ ان مخصوص آیات اور سورتوں کے مجموعے کو انہوں نے ''قرآنِ مجید کا منتخب نصاب'' کا نام دیا۔

منتخب نصاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

منتخب نصاب حصہ اول

اس حصہ میں سورۃ العصر، آیۃ البر (البقرۃ ۱۷۷)، سورۃ لقمان (رکوع ۲) اور سورۃ حمٰ السجدۃ (آیۃ ۳۰ تا ۳۶) کے جامع اسباق ہیں۔ مباحث ایمان کے ضمن میں سورۃ الفاتحہ، سورۃ آل عمران (۱۹۰ تا ۱۹۵)، سورۃ النور رکوع ۵، سورۃ التغابن (مکمل)، اور سورۃ القیامہ (مکمل) کو شامل کیا گیا ہے۔ مباحث صالح کے ذیل میں سورۃ المومنون (آیۃ ۱ تا ۱۱)، سورۃ المعارج (آیۃ ۱۹ تا ۳۵)، سورۃ الفرقان (آخری رکوع)، سورۃ التحریم (مکمل)، سورۃ بنی اسرائیل رکوع ۳، ۴ اور سورۃ الحجرات (مکمل) شامل کی گئی ہے۔ جہاد و قتال کا تصور واضح کرنے کے لیے سورۃ الحج کا آخری رکوع، سورۃ التوبہ (آیۃ ۲۴)، سورۃ الصف (مکمل)، سورۃ الجمعۃ (مکمل) اور سورۃ المنافقون (مکمل) شامل کی گئی ہے۔ صبر و مصابرت کی حقیقت واضح کرنے کے لیے سورۃ العنکبوت رکوع نمبر ا، سورۃ البقرۃ (آیۃ ۲۱۴)، سورۃ اٰل عمران (آیۃ ۱۴۲)، سورۃ التوبہ (آیۃ ۱۶)، سورۃ العنکبوت آخری تین رکوع، سورۃ الکہف ۶۷ تا ۶۹، سورۃ البقرۃ، ۱۵۳ تا ۱۵۷، سورۃ الانفال، ۱ تا ۱۰، ۲۷ تا ۷۵، سورۃ اٰل عمران ۱۲۱ تا ۱۲۹، ۱۳۹ تا ۱۴۸، سورۃ الاحزاب رکوع ۲، ۳ سورۃ الفتح آخری رکوع اور سورۃ التوبہ ۳۸ تا ۵۷۔

منتخب نصاب حصہ دوم

فرائض دینی کا جامع تصور اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقاصد و مراحل بیان کرنے کے لیے سورۃ

الحج کی آخری دو آیات اور سورۃ صف کی آیات ۹ تا ۱۱ کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ اقامت دین کی فرضیت اور اس کے لیے زور دار دعوت کے ضمن میں سورۃ شوریٰ (آیات ۱۳ تا ۱۵) اور (آیات ۴۷، ۴۸) کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں اسلامی انقلاب کے لیے سورۃ اٰل عمران، آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ اور سورۃ توبہ آیات ۱۱۱، ۱۱۲ کو آخری اقدام کا عنوان دیا گیا ہے۔ سورۃ شوریٰ: آیات ۳۶ تا ۴۳، سورۃ فتح آخری آیت اور سورۃ مائدہ: آیت ۵۴ کے تحت اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ سورۃ مائدہ: آیات ۵۵، ۵۶ اور سورۃ مجادلہ: آیات ۱۴ تا ۲۲ کو حزب اللہ کی تشکیل میں فیصلہ کن عامل بمقابلہ حزب الشیطان، کے عنوان کے تحت منتخب نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی اور تنظیمی اساس بیان کرنے کے لیے سورۃ صف کی آخری آیت، سورۃ توبہ: آیت ۱۱۱، سورۃ فتح: آیت ۱۰، اور سورۃ فتح کی آیت ۱۸ کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ نظم جماعت کی پابندی اور اس سے رخصت اور معذرت کا معاملہ واضح کرنے کے لیے سورۃ نور: آیات ۶۲ تا ۶۴ اور سورۃ توبہ: آیات ۴۳ تا ۴۹ کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ سورۃ نور: آیات ۵۴ تا ۵۶، سورۃ نساء آیت ۵۹، سورۃ انفال آیت ۴۶، سورۃ آل عمران: آیت ۱۵۲، ۱۵۴، اور سورۃ مجادلہ: آیات ۹ تا ۱۱ کے ذریعے اطاعت امر بمقابلہ "تنازع فی الامر" و "نجویٰ" کو واضح کیا گیا ہے اور امراء کا اپنے رفقاء کے ساتھ طرز عمل اور اسوۂ رسول ﷺ واضح کرنے کے لیے سورۃ شعراء: آیات ۲۱۴ تا ۲۱۷، سورۃ حجر: آیت ۸۸ سورۃ کہف: آیت ۲۸، سورۃ انعام: آیات ۵۲ تا ۵۴، سورۃ توبہ آیت ۱۲۸، اور سورۃ آل عمران: آیت ۱۵۹ کو منتخب نصاب کے حصہ دوم میں شامل کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کا منتخب نصاب مرتب کرنا بلا شبہ ڈاکٹر اسرار احمد کی بہت بڑی کاوش ہے اور اس نصاب کے ذریعے انہوں نے امت مسلمہ کے وسیع حلقے کو قرآن سے قریب کیا ہے۔ لیکن اس منتخب نصاب کا ایک منفی اثر ان کی اپنی تنظیم میں یہ ہوا ہے کہ ان کے رفقاء نے اپنے آپ کو اسی منتخب نصاب تک محدود کر لیا ہے اور بقیہ قرآن کی طرف ان کی توجہ نہیں رہی۔ دروس قرآن کے حلقوں میں بالعموم اسی نصاب پر تقاریر و مباحثے ہوتے ہیں حتیٰ کہ نمازوں میں بھی یہ لوگ قرآن مجید کے صرف انہیں حصّوں کی تلاوت پر اکتفا کرتے ہیں جو منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ یہ ایک غیر متوازن رویّہ ہے جو تنظیم اسلامی کے رفقاء میں پایا جاتا ہے۔ اگر ڈاکٹر اسرار احمد مخصوص آیات اور سوَر کے بجائے پورے قرآن کو

ہی اپنی تقاریر اور دروس کا محور بناتے تو یقیناً یہ افسوس ناک صورتحال پیدا نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کوئی بھی آیت یا سورت غیر ضروری یا اضافی نہیں ہے بلکہ قرآن کا ہر ہر لفظ ہماری فطرت کی پکار اور ہماری ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ پورے قرآن کو اپنی توجہ کا مرکز و محور بنائیں نہ کہ مخصوص آیات و سور کو۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے تنظیم اسلامی کے تاسیسی اجلاس کی افتتاحی نشست میں بھی ایک بار پھر اپنے مطالعہ قرآن کا نچوڑ پیش کیا اور سورۃ صف کے دوسرے رکوع اور سورۃ حجرات کی آیات ۱۴، ۱۵ کے حوالے سے فرائض دینی کا جامع تصور واضح کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ۶۷ء والی قرارداد تاسیس مع توضیحات پڑھ کر سنائی اور اس کی پرزور وکالت کی[26]۔

یہ بات قابل تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے قریبی رفقا جنہیں یہ معلوم تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک قرارداد رحیم آباد میں تبلیغی رنگ زیادہ ہے، نے یہ اعتراض کیوں نہ کیا کہ اس قرارداد میں ترمیم کی جائے؟ اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی کے سابقین کو تنظیم اسلامی میں شامل کرنے کے لیے قرارداد میں تبدیلی نہیں کر رہے تھے تو یہ بھی حیرانی کی بات ہے کیونکہ تاسیسی اجلاس میں تو سابقین جماعت اسلامی میں سے کوئی اہم شخصیت سوائے شیخ جمیل الرحمن کے شامل نہیں ہوئی تھی۔

افتتاحی نشست میں قرارداد تاسیس بغیر کسی اختلاف کے منظور کر لی گئی۔ اگلہ مرحلہ، نام، شرائط شمولیت، ہیت تنظیمی اور قواعد وضوابط کی منظوری کا تھا۔ جن میں سے نہ نام کے سلسلے میں کوئی ردّو قدح ہوئی، نہ ہیتِ تنظیمی اور قواعد وضوابط کے ضمن میں کوئی مشکل پیش آئی، البتہ بقول ڈاکٹر اسرار احمد، "شرائط شمولیت" میں شامل بعض کڑوی گولیوں کا نگلنا موجود الوقت حالات میں بہت سے احباب کو دشوار ہی نہیں محال نظر آیا[27]۔

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ واضح کر دیا تھا کہ حرام زرائع آمدنی خاص طور پر سود سے اپنے آپ کو بچانا ہو گا۔ یہ وہ کڑوی گولی تھی جس کا نگلنا بہت سے احباب کے لیے مشکل

---

[26] حوالہ سابق، ص ۱۲۔۱۳۔

[27] حوالہ سابق، ص ۱۲۔۱۳۔

تھا۔ نام کے ضمن میں اتفاق رائے کے ساتھ "تنظیم اسلامی" ہی کے حق میں فیصلہ ہو گیا اور اس وقت کے دستور تنظیم اسلامی کی دفعہ۔ ا یہ قرار پائی:

"اس تنظیم کا نام تنظیم اسلامی ہو گا"

اسی طرح ہیت تنظیمی کے ضمن میں یہ طے ہوا کہ تنظیمی اعتبار سے پہلے تین سال ایک عبوری دور شمار ہوں گے جن کے دوران میں مقدور بھر سعی کی جائے گی کہ تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کی وہ دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچادی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہو سکیں۔

تنظیم اسلامی کے قیام کے موقع پر اختیار کردہ محولہ بالا طریقہ منفرد ہے۔ عام طور پر جب جماعتیں قائم ہوتی ہیں تو نظریے کی دعوت کو عام کرنے کی بجائے افرادی قوت کو بڑھانے پر توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد نے پہلے فکر کو پر زور طریقے سے پھیلانے پر توجہ دی۔ اگر دعوت اسلامی یا جماعت الدعوۃ کے ماضی پر نظر ڈالی جائے تو ان جماعتوں کو ابتدا سے ہی ایسا طبقہ میسر آگیا جو ان جماعتوں سے نظریاتی تعلق رکھتا تھا۔ جب کہ تنظیم اسلامی کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ اس جماعت نے اپنی فکر کے ذریعے ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو متاثر کیا اور اپنے اندر سمو لیا جب کہ جماعت الدعوۃ اور دعوت اسلامی کو ایسے لوگ میسر آئے جو خاندانی طور پر ان جماعتوں سے نظریاتی وابستگی رکھتے تھے۔

تاسیسی اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ تین سال کے عرصے کی تکمیل پر ایک عام اجتماع طلب کیا جائے گا جو "تنظیم اسلامی" کے لیے مستقل دستور طے کرے گا۔ اس اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ ڈاکٹر اسرار احمد کو تنظیم اسلامی کے "داعی عمومی" کی حیثیت حاصل ہو گی اور وہ اس عبوری دور میں "امرھم شوریٰ بینھم" کے وسیع تر اصول کے تحت تنظیم کے معاملات کو بھی چلائیں گے اور اس کی دعوت کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع تر حلقے تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک معین مجلس شوریٰ کو بھی نامزد کرنے کے مجاز ہوں گے۔ لیکن ان کو حق استقرار حاصل ہو گا نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ تمام رفقائے تنظیم داعی عمومی کی "اطاعت فی المعروف" کے پابند ہوں گے[28]۔

تاسیسی اجلاس میں مشاورت کی اہمیت کو محسوس کیا گیا نیز اطاعت فی المعروف پر بھی زور دیا گیا۔ اگر ان دونوں چیزوں میں توازن ہو تو تمام معاملات احسن طریقے سے نمٹ سکتے ہیں۔ بعد کے

---

[28] حوالہ سابق، ص ۱۳۔ ۱۴۔

حالات نے یہ ثابت کیا کہ تنظیم اسلامی میں مشاورت کے عمل کو کافی حد تک نظر انداز کر دیا گیا اور اطاعت امیر کو ہی اہمیت دی جانے لگی۔ جس کی واضح مثال ڈاکٹر اسرار احمد کا اپنے بیٹے حافظ عاکف سعید کو امیر نامزد کرنا اور حافظ عاکف سعید کا اظہر بختیار خلجی کو ناظم اعلیٰ مقرر کرنا ہے۔

تنظیم اسلامی کا سالانہ اجلاس

تنظیم اسلامی کا پہلا سالانہ اجتماع ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۷۶ء اپنے مقامِ تاسیس ہی پر منعقد ہوا تھا۔ دوسرے سالانہ اجتماع کے انعقاد کے لیے بھی اواخر مارچ ۱۹۷۷ء کی تاریخوں کا تعین ہو چکا تھا کہ بقول ڈاکٹر اسرار احمد:

"اچانک ملکی انتخابات میں حکومت وقت کی جانب سے کی گئی دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں نے ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ لہٰذا تنظیم کے اجتماع کو ملتوی کرنا پڑا"[29]۔

۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو امن و امان کی صورتحال بحال ہوئی اور چونکہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ تین ماہ بعد مارشل لاء کے اختتام پر ملک میں دوبارہ کیسے حالات پیدا ہو جائیں۔ لہٰذا بعض اہم رفقاء کے مشورے سے یہ طے کر لیا گیا کہ پہلی فرصت میں تنظیم کا ایک اجتماع منعقد کر لیا جائے جو دوسرے اور تیسرے سالانہ اجتماعات کا قائم مقام ہو اور اس میں تنظیم کے مستقل نظام کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔ چنانچہ ۵ تا ۱۱ اگست ۱۹۷۷ء، قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن لاہور میں اجتماع ہوا اور یہ طے ہوا کہ تنظیم اسلامی میں بیعت کے اصول کو اختیار کیا جائے گا اور تنظیم اسلامی کے داعی عمومی ڈاکٹر اسرار احمد اب "امیر تنظیم اسلامی" ہوں گے[30]۔

امیر کا انتخاب دراصل ایک نامزدگی تھی۔ چونکہ ڈاکٹر اسرار احمد ہی کی تحریک پر ایک نئی جماعت وجود میں آئی تھی اور وہی اس تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے اس لیے تمام رفقاء نے بغیر کسی اختلاف کے یہ مناسب سمجھا کہ میر کارواں کے طور پر ڈاکٹر اسرار احمد سب سے زیادہ موزوں ہیں اور یہ ڈاکٹر صاحب کا حق بھی تھا۔

---

[29] ڈاکٹر اسرار احمد، اداریہ ماہنامہ میثاق، مدیر ڈاکٹر اسرار احمد، لاہور، مارچ ۱۹۷۶ء، ص ۳۔
[30] تعارف تنظیم اسلامی، ص ۱۸۔۱۹۔

تنظیم اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ

تنظیم اسلامی کا انتظامی ڈھانچہ مرکزی نظام، حلقہ جاتی نظام، مقامی تنظیموں، اُسرہ جات اور منفرد رفقاء پر مشتمل ہے۔ خواتین کا علیحدہ نظم قائم ہے۔ اس میں بھی یہ تمام درجات موجود ہیں۔

سب سے بنیادی یونٹ اُسرہ ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں خاندان۔ اس میں بالعموم ۳تا ۱۰ رفقاء ہوتے ہیں۔ اُسرے کا سربراہ نقیب کہلاتا ہے۔ کسی مقام پر دو یا زائد اُسرہ جات کی موجودگی میں بالعموم مقامی تنظیم قائم کردی جاتی ہے۔ مقامی تنظیم کا سربراہ امیر مقامی تنظیم کہلاتا ہے۔

دعوت کی توسیع اور تنظیمی رابطوں کو آسان اور مستحکم بنانے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں حلقہ جات قائم ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں دعوتی اور تنظیمی سرگرمیوں نیز مالی معاملات کے حوالے سے خود مکتفی اور ذمہ دار ہیں۔

مرکزی نظم میں امیر تنظیم کے بعد اہم ترین عہدہ ناظم اعلیٰ کا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف شعبہ جات مثلاً مالیات، دعوت، تربیت اور نشر و اشاعت قائم ہیں۔

نظم

کسی بھی جماعت یا تنظیم میں نظم (یعنی اختیاراتی ترتیب) کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ جماعت یا تنظیم جو کسی نئے نظام کو قائم و نافذ کرنے کی دعویدار ہو۔ تنظیم اسلامی میں اُسرہ جاتی نظام بیسویں صدی عیسوی کی معروف انقلابی تحریک اخوان المسلمون سے مشابہ ہے۔ لیکن حسن النبا(۴۹۔۱۹۰۶ء) نے جس طرح اُسرہ کے بنیادی یونٹ کو منظم کیا، تنظیم اسلامی اس طرح کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اخوان المسلمون کے نظام اُسرہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے پروفیسر خورشید احمد ایک جگہ لکھتے ہیں:

”میرے نزدیک 'نظام اُسرہ' میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ اس کے ممبران ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں پورے شعور اور وابستگی سے شرکت کریں۔ ایک دوسرے کا سہارا بنیں۔ کسی ایک ساتھی پر کوئی مصیبت آئے تو 'اُسرہ' کے تمام ساتھی اس کی مدد کو پہنچیں“[31]۔

---

[31] پروفیسر خورشید احمد، یادوں کے جھروکے، ماہنامہ ترجمان القرآن، مدیر پروفیسر خورشید احمد، لاہور، حسن البنا شہید نمبر، مئی ۲۰۰۷ء، ص۱۹۔۲۰۔

صدر ناصر (۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء تا ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء) کے زمانے میں جب اخوان المسلمون کے ۳۰ سے ۴۰ ہزار افراد صرف مصر کی جیلوں میں تھے تو بقول پروفیسر خورشید احمد:

"اسی نظام اُسرہ نے قیدی ساتھیوں کے خاندانوں کی دست گیری، عملی مدد اور ہمت بندھانے میں معاونت کی ہے"[32]۔

تنظیم اسلامی کے نظام اُسرہ میں اگرچہ طریقہ کار اخوان والا ہی ہے لیکن وہ گہرا تعلق نہیں ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کے قائدین نقباء کے تقرر میں میرٹ پر عمل نہیں کر سکے۔ کیونکہ تنظیم اسلامی میں افرادی قوت کی کمی کی وجہ سے تربیت یافتہ نقبا کی بھی کمی ہے۔

تنظیم میں نظم نیچے سے اوپر کو اس طرح سے ہے۔

نقیبِ اسرہ....... امیر مقامی تنظیم .... امیر حلقہ........ناظم اعلیٰ .... امیر تنظیم اسلامی۔

شرکاء تنظیم کو سمع و اطاعت کا خوگر بنانے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور تمام رفقاء کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ اپنے سینئر کا حکم بغیر لیت و لعل کے تسلیم کیا جائے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر ایک انقلابی جماعت میں آرمی والا ڈسپلن نہ ہو تو ایسی جماعت انقلاب برپا نہیں کر سکتی۔ رسول اکرم ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کی کامیابی کی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کے ساتھی آپ ﷺ کے ہر حکم پر بلا تاخیر عمل کرتے تھے۔

مالیات

تنظیم اسلامی کے نظام العمل میں نظام مالیات کے حوالے سے درج ذیل ہدایات درج ہیں۔

الف۔ منفرد رفقاء اپنی ماہانہ اعانتیں حلقہ کے بیت المال میں جمع کرائیں گے۔

ب۔ تنظیم میں مستقل بیت المال صرف مرکز، حلقہ اور مقامی تنظیم کی سطح پر ہو گا۔

ج۔ مرکزی بیت المال امیر تنظیم، نائب امیر / ناظم اعلیٰ اور ناظم بیت المال کی مشترکہ تحویل ہو گا[33]۔

---

[32] حوالہ سابق، ص ۲۰۔

[33] نظام العمل تنظیم اسلامی، ترمیم شدہ مارچ ۲۰۰۰ء، شائع کردہ مرکز تنظیم اسلامی، گڑھی شاہو، لاہور، ص ۱۵۔

تنظیم اسلامی اپنے (تنظیمی و دعوتی) اخراجات کے لیے اپنے رفقاء و رفیقات ہی کے جذبہ انفاق پر انحصار کرتی ہے اور عام چندے کی اپیل نہیں کرتی۔ تنظیم کے شرکاء بالعموم ہر ماہ تنظیم کے لیے انفاق کرتے ہیں جس کی وصولی، خرچ اور آڈٹ کا باقاعدہ نظام تنظیم میں ہر سطح پر موجود ہے۔

دعوت

تنظیم اسلامی میں دعوت کا سب سے بڑا ذریعہ درس قرآن ہے۔ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر اُسرہ کی سطح پر درس قرآن کا انعقاد کیا جائے۔ اس کے علاوہ فہم دین پروگراموں کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے۔

دعوت کے ضمن میں کتب، رسائل و جرائد اور آج کے دور میں بالخصوص آڈیو، ویڈیو کیسٹس اور CDs اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تنظیم اسلامی ان ذرائع کا بھرپور استعمال کر رہی ہے۔ پاکستان میں کچھ اور جماعتیں بھی CDs وغیرہ کا استعمال کرتی ہیں جن میں تحریک منہاج القرآن اہم ہے۔ تحریک منہاج القرآن کے قائد ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے سینکڑوں خطابات کی CDs تیار کی گئی ہیں۔ لیکن ان کی کیسٹس ایک مخصوص طبقے میں سنی جاتی ہیں کیونکہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری سنی بریلوی مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے خطابات ہر شعبہ زندگی اور مکتب فکر کے لوگ سنتے ہیں۔ اگر دونوں تحریکوں کے قائدین کے خطابات کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے بے شمار موضوعات پر تقاریر کی ہیں جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے موضوعات محدود ہیں اور ان کی تقاریر کا مرکز و محور قرآن مجید ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے علوم اسلامیہ و عربیہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے اور جھنگ میں کچھ عرصہ وکالت بھی کی ہے جس کی وجہ سے ان کی سوچ میں کافی وسعت ہے جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد بنیادی طور پر میڈیکل ڈاکٹر ہیں انہوں نے اگرچہ M.A. Islamiat بھی کیا لیکن اپنے آپ کو صرف دروس قرآن تک محدود رکھا۔ جس کی وجہ سے ان کے تقریری موضوعات میں تنوع پیدا نہ ہو سکا۔ تنظیم اسلامی میں ماہنامہ "میثاق"، ماہنامہ "حکمت قرآن" اور ہفت روزہ "ندائے خلافت" کو تنظیم کے ترجمان جرائد کی حیثیت حاصل ہے۔ تنظیم کی اپنی ویب سائٹ www.tanzeem.org کے نام سے موجود ہے جس پر امیر تنظیم کا تازہ خطاب جمعہ، بانی تنظیم کے متعدد خطابات و دروس اور ہفت روزہ ندائے خلافت upload کیے جاتے ہیں۔

تربیت

تنظیم اسلامی مرکزی سطح پر قریباً ہر ماہ ایک ہفتہ روزہ تربیتی کورس کا اہتمام کرتی ہے جو مرکزی دفتر تنظیم اسلامی کے علاوہ ضرورت کے مطابق حلقہ جات کے دفاتر میں بھی (جہاں ممکن ہو) منعقد کی جاتی ہیں۔ مرکزی سطح پر خط و کتابت کے ذریعے بھی یہ کام سرانجام دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی تنظیم اور اُسرہ جات کی سطح پر بھی تربیتی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں اور مقامی ذمہ دار حضرات انفرادی سطح پر بھی یہ کام سرانجام دیتے ہیں[34]

تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت

تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت تین بنیادی دینی اصطلاحات پر مبنی ہے۔ یعنی

۱۔ تجدید ایمان ۲۔ توبہ ۳۔ تجدید عہد[35]۔

یہی وجہ ہے کہ تنظیم میں شمولیت جس عہد نامے کے ذریعے ہوتی ہے اس میں بھی ان ہی امور سہہ گانہ کا ذکر ہے یعنی پہلا کلمہ شہادت کی ادائیگی جو گویا تجدید ایمان کے مترادف ہے۔ دوسرا توبہ اور استغفار اور تیسرا اللہ تعالیٰ سے عہد کہ ہر اس چیز کو ترک کردوں گا جو اسے ناپسند ہے۔

تنظیم میں شمولیت

روئے ارضی کے کسی بھی مقام پر قیام پذیر ہر بالغ مسلمان (خواہ مرد ہو یا عورت) تنظیم میں شامل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ

۱۔ تنظیم کے اساسی نظریات اور تصورات سے فی الجملہ متفق ہو اور

۲۔ امیر تنظیم سے بیعت مسنونہ کے رشتے میں منسلک ہو جائے[36]۔

تنظیم اسلامی میں مقدار کی بجائے معیار پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور جو شخص دین پر نہ چلے، تنظیم اسے خارج بھی کر دیتی ہے۔ یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے جو بہت کم جماعتوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ ایسی دینی جماعتیں بھی ہمارے ملک میں ہیں جن کے ذمہ دار بھی نمازوں سے غافل ہوتے ہیں۔

---

34 تنظیم اسلامی ایک نظر میں، ناشر تنظیم اسلامی پاکستان، ص ۱۱۔

35 حوالہ سابق، ص ۵۔

36 دستور تنظیم اسلامی، ترمیم شدہ جون ۲۰۰۲ء، شائع کردہ تنظیم اسلامی گڑھی شاہو، لاہور، ص ۶۔

تنظیم کے اساسی نظریات

ذیل میں تنظیم کے اساسی نظریات کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

اسلام دین ہے، محض مذہب نہیں۔ اس میں نہ صرف انفرادی زندگی بلکہ اجتماعی زندگی کے بارے میں بھی تفصیلی احکامات دیئے گئے ہیں۔ انفرادی زندگی کے تین نمایاں گوشے درج ذیل ہیں۔

۱۔ عقائد ۲۔ عبادت کے طور طریقے

۳۔ پیدائش، شادی بیاہ اور وفات سے متعلق معاشرتی رسومات۔

جب کہ اجتماعی زندگی کے نمایاں گوشوں میں سماجی نظام، معاشی نظام اور سیاسی نظام شامل ہیں۔

عقائد اور بنیادی تصورات

تنظیم اسلامی کے عقائد اور بنیادی دینی تصورات چھ شقوں پر مشتمل ہیں، جن کا خلاصہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

پہلی شق: ایمان مجمل اور ایمان مفصل کے بیان پر مشتمل ہے جن کی تشریح میں اہل سنت کے عقائد اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ آ گئے ہیں۔

دوسری شق: کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کی تشریح پر مشتمل ہے۔ اس میں اللہ کی توحید اور محمد مصطفی ﷺ کے اقرار کے فکری و عملی تقاضوں کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک خلافت راشدہ چونکہ اصلاً خلافت علی منہاج النبوۃ کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اس کے دوران جن امور پر امت کا اجماع ہو گیا انہیں دین کے دستوری اور قانونی نظام میں حجت کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ہمارے نزدیک عظمت صحابہؓ اور حجیتِ خلافت راشدہ کو نبی اکرم ﷺ کی رسالت مبارکہ کے ساتھ تتمے اور ضمیمے کی حیثیت حاصل ہے۔

تیسری اور چوتھی شقیں: شرک، کفر اور زمائم اخلاق سے برأت، تمام معاصی اور گناہوں سے توبہ و استغفار پر مشتمل ہیں جن کے ضمن میں جہاں کفر و شرک کی حقیقت اور ان کی اقسام کی مختصر مگر جامع وضاحت آ گئی ہے وہاں فرائض و واجبات دینی اور محرمات و منہیات شرعی کا اجمالی تذکرہ بھی ہو گیا ہے اور ان ہی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسب معاش کے سلسلے میں محرمات و منکرات سے اجتناب کیا

جائے۔

پانچویں اور چھٹی شقیں: دو معاہدوں پر مشتمل ہیں: پہلا عہد اللہ سے کہ میں نے اپنا رُخ ہر جانب سے یکسو ہو کر صرف 'تیری جانب' کر لیا ہے اور اب میری نماز اور قربانی کی طرح میرا جینا اور مرنا بھی صرف تیرے لیے ہو گا اور دوسرا عہد امیر تنظیم اسلامی سے کہ میں آپ کے ایسے تمام احکام کی اطاعت جو شریعت کی کسی واضح نص کے خلاف نہ ہوں، "سمع و اطاعت" کی ٹھیٹھ اسلامی روح کے مطابق کروں گا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تنظیم اسلامی میں تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کے اصولوں کو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے جس کی تصدیق کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام دینی جماعتوں کے مقابلے میں تنظیم اسلامی میں رفقا کے کردار پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ رفقاء مندرجہ بالا ہدایات پر یکسوئی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ اگر ہم تبلیغی جماعت کے ساتھ موازنہ کریں تو حالت مایوس کن لگتی ہیں۔ کیونکہ تبلیغی جماعت کے نظریات سے قطع نظر اگر لوگوں کی قربانیوں کو دیکھا جائے تو انسان حیران ہو جاتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ دس دن، چار ماہ، ایک سال وغیرہ کے لیے اپنے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ تنظیم اسلامی میں شامل لوگوں کی درس قرآن، اسرہ کی میٹنگ اور ماہانہ اجتماع میں شرکت مایوس کن ہوتی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کا دعویٰ محض دعویٰ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے تنظیم اسلامی کے قائدین اپنے رفقاء میں وہ جذبہ پیدا کرنے کی فکر کریں جو جذبہ صحابہ کرامؓ میں موجود تھا۔ اس مقصد کے لیے رفقاء کو زیادہ سے زیادہ تربیتی کورسز کرانے کی اشد ضرورت ہے جس کی تنظیم میں ابھی کمی ہے۔

نظام بیعت

تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے بیعت کا نظام اختیار کیا گیا ہے۔ جو بھی شخص تنظیم میں شامل ہونا چاہے اسے امیر تنظیم کے ہاتھ پر بیعت کرنا پڑتی ہے۔ بیعت فارم کی سہولت بھی موجود ہے، اگر فارم پر کر دیا جائے تو اسے بھی قبول کر لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک:

"ایک منظم جماعت کی تنظیم کے لیے جو مسنون، ماثور اور منصوص بنیاد ملتی ہے وہ بیعت سمع

وطاعت ہے۔ سیرت النبی ﷺ میں ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی نظیر نہیں ہے"[37]

تنظیم اسلامی میں نظام بیعت کی وجہ سے امیر تنظیم کے فیصلے کو حرف آخر سمجھتا جاتا ہے اور یہی آمریت نچلی سطح پر بھی منتقل ہوئی ہے۔ اگرچہ مشاورت کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے لیکن آمریت ہی کا راج ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے بیٹے حافظ عاکف سعید کو امیر تنظیم نامزد کر دیا۔

نظام بیعت کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اگر اس کے ساتھ مشاورت کا بھرپور انتظام نہ ہو تو یہ نظام آمریت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انقلاب کے آخری مرحلے میں امیر کے ہر حکم کے آگے سر جھکانے سے ہی کامیابی مل سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ عمومی حالات میں بھی آمرانہ رویہ اختیار کیا جائے۔

معاشرے میں انقلاب کا طریقہ کار

جب ہم تنظیم اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہر کتابچے کی پشت پر یہ تحریر پڑھنے کو ملتی ہے: "تنظیم اسلامی نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے نہ معروف معنی میں کوئی سیاسی جماعت بلکہ ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے۔ جو سب سے پہلے پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں اسلام کے عادلانہ نظام یعنی نظام خلافت کو قائم اور غالب کرنا چاہتی ہے"[38]۔

مندرجہ بالا تحریر اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ تنظیم اسلامی معاشرے میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کی خواہاں ہے۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد اپنے خطبات میں اسلامی انقلاب کے لیے چھ مراحل کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ دعوت ۲۔ تنظیم ۳۔ تربیت ۴۔ صبر محض اور عدم تشدد ۵۔ اقدام اور چیلنج ۶۔ مسلح کشمکش یعنی قتال فی سبیل اللہ[39]۔

پہلا مرحلہ دعوت

ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک انقلاب کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی نظریہ، کوئی انقلابی فکر،

---

37 ڈاکٹر اسرار احمد، جہاد فی سبیل اللہ، ناشر شعبہ دعوت تنظیم اسلامی، اشاعت دوم، فروری ۲۰۰۷ء، ص ۶۱۔

38 ڈاکٹر اسرار احمد، تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، بار دوم اگست ۱۹۹۲ء، ص آخر۔

39 ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی ﷺ، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، بار پنجم اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۸۔۱۴۔

کوئی انقلابی فلسفہ ہو اور اس کی نشر و اشاعت ہو، اسے پھیلایا جائے، اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور لوگوں کو اس نظریہ کی افادیت کا دلائل سے قائل بنایا جائے[40]۔

اس وقت معاشرے میں جتنی دینی تحریکیں کام کر رہیں ہیں، ان کے نزدیک بھی ابتدائی مرحلہ دعوت ہی ہے۔ خود رسول ﷺ نے جب کام کا آغاز کیا تو سب سے پہلے آپ نے لوگوں کو دین کی طرف دعوت دی اور ایک نظریہ ان کے سامنے پیش کیا۔

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری (م:۲۰۰۷ء) نے اپنی کتاب الرحیق المختوم میں نبی ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ مکی زندگی ۲۔ مدنی زندگی

انہوں نے مکی زندگی کو مزید تین مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ پس پردہ دعوت کا مرحلہ ۲۔ اہل مکہ میں کھلم کھلا دعوت و تبلیغ کا مرحلہ

۳۔ مکہ کے باہر اسلام کی دعوت کی مقبولیت اور پھیلاؤ کا مرحلہ[41]۔

گویا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مشن کا آغاز دعوت سے کیا اور بانی تنظیم اسلامی نے بھی اسلامی انقلاب کا پہلا مرحلہ دعوت ہی کو قرار دیا ہے۔

دوسرا مرحلہ: تنظیم

بانی تنظیم اسلامی نے دعوت کے بعد کا مرحلہ تنظیم کو قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جو لوگ اس انقلابی نظریہ کو ذہناً قبول کر لیں کہ ہاں یہ صحیح ہے، حق ہے، تو اب ان کو منظم کیا جائے۔ ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے اور اس جماعت کے لیے دو چیزیں لازمی ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ اس کی درجہ بندی بالکل نئی ہونی چاہیے۔ جس نے جتنی پیش قدمی کی ہے اتنا ہی وہ آگے چلا جائے گا۔ چاہے سابقہ نظام میں وہ شودروں اور اچھوتوں میں شمار ہوتا ہو اور دوسری چیز یہ کہ اس پارٹی کا اگر نظم (Discipline) فوج والا نہ ہو تو یہ پارٹی انقلاب نہیں لا سکتی[42]۔

---

[40] حوالہ سابق، ص۸۔

[41] مولانا صفی الرحمن مبارکپوری، الرحیق المختوم، المکتبہ السلفیہ، لاہور، نومبر ۱۹۹۶ء، ص۱۰۷۔

[42] منہج انقلاب نبوی ﷺ، ص۹۔۱۰۔

کسی بھی دینی تحریک کے لیے محولہ بالا دونوں باتیں بے حد ضروری ہیں۔ لیکن عملاً تنظیم اسلامی میں بھی صورت حال حوصلہ افزا نظر نہیں آتی۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو واقعی تنظیم اسلامی حضور اکرم ﷺ کے اسوۃ پر عمل پیرا ہے اور اُسرہ جات کے نقبا انہیں کو بنایا جاتا ہے جن میں خلوص زیادہ ہو۔ اس اعتبار سے اس تنظیم کو یہ امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ اکثر جماعتوں میں عہدوں کی تقسیم کے وقت میرٹ کی بجائے تعلقات اور خاندانی پس منظر کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ جہاں تک ڈسپلن کا معاملہ ہے تو تنظیم اسلامی میں اس کی بہت کمی ہے۔ ماہانہ تنظیمی اجتماعات میں رفقاء کی حاضری تسلی بخش نہیں ہوتی۔ سہ ماہی مظاہروں میں بھی رفقاء اور نقباء اس نظم وضبط کا مظاہرہ نہیں کرتے جس کا تقاضا بانی تنظیم اسلامی کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرٹ اور ڈسپلن کی حامل جماعت ہی معاشرے میں اسلامی انقلاب برپا کر سکتی ہے۔

تیسرا مرحلہ: تربیت

تربیت ہر انقلابی عمل کی ناگزیر ضرورت ہے۔ بانی تنظیم اسلامی کے نزدیک اسلامی انقلاب کے لیے تیسرا مرحلہ تربیت ہے۔ جب ایک شخص تنظیم اسلامی کی فکر سے متاثر ہو کر رفاقت فارم پر کر دیتا ہے تو اسے نقیب اُسرہ کی جانب سے یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ پہلی فرصت میں مبتدی تربیتی کورس کرے۔

یہ کورس سات روزہ ہوتا ہے۔ جس میں دین کے بنیادی تصورات مثلاً ارکان اسلام، عقائد، معاملات وغیرہ پر لیکچرز دیے جاتے ہیں۔ مبتدی کورس کرنے والے رفیق کو چند کتب بطور نصاب پڑھنے کے لیے دی جاتی ہیں جن کا مطالعہ کرنے والے رفیق کو ملتزم رفیق قرار دیا جاتا ہے اور اس سے یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ملتزم تربیتی کورس کرے جس میں حدیث، فقہ اور قرآن مجید کے بارے میں مفید معلومات دی جاتی ہیں۔ ان تربیت گاہوں میں جو ملک کے مختلف شہروں میں موجود قرآن اکیڈمیوں میں ہوتی ہیں، شرکاء کی اخلاقی وروحانی اصلاح کا بھی خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ ان تربیتی کورسز کے علاوہ اُسرہ جاتی میٹنگ اور ماہانہ تنظیمی اجتماع بھی رفقاء کی تربیت کے ذرائع ہیں۔ ہر رفیق کو ذاتی احتسابی یادداشت بک دی جاتی ہے جس میں روزانہ رات کو اس بات کا اندراج کیا جاتا ہے کہ دن میں کتنی نمازیں جماعت سے پڑھی ہیں؟ کیا قرآن کی تلاوت کی ہے یا نہیں؟ وغیرہ۔ رفقاء کی تربیت کے حوالے سے تنظیم اسلامی میں

ایک کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے اور وہ رفقاء کی تجوید ہے۔ تربیتی کورسز میں رفقاء کی تجوید بہتر کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی جس کی وجہ سے بیشتر رفقا قرآن مجید کو صحیح انداز سے نہیں پڑھ پاتے۔

چوتھا مرحلہ: صبر محض

یہ مرحلہ ہے صبر محض کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انقلابی جماعت ایک نظام کو فاسد قرار دیتی ہے تو لوگ اس جماعت کو معاف نہیں کریں گے۔ پہلے وہ انقلابی فکر و نظریہ کو چٹکیوں میں اڑائیں گے۔ استہزاء اور تمسخر کریں گے، لیکن اگر اس انقلابی جماعت کا قائد اور اس کے معدودے چند ساتھی اس وار کو جھیل گئے اور نظریہ کی نشرواشاعت کا عمل جاری ہے، آگے بڑھ رہا ہے اور لوگ اس کو قبول کر کے جماعت میں شامل ہو رہے ہیں تو مخالفین کو محسوس ہو گا کہ یہ ہوا کا کوئی معمولی جھونکا نہیں ہے۔ اس میں تو ایک زبردست آندھی اور طوفان کے آثار پوشیدہ ہیں جو ہمارے تمام مفادات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائیں گے۔ لہٰذا اب تشدد (Persecution) شروع ہو گا۔ اس مرحلہ پر تنظیم اسلامی کا موقف ڈاکٹر اسرار احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ "اس دور کے لیے انقلابی جماعت کی حکمت عملی یہ ہو گی کہ ماریں کھاؤ لیکن نہ اپنے موقف سے ہٹو اور نہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ اس عدم تشدد کی پالیسی پر کاربند رہنے سے وہ لوگ (یعنی نظام باطل کے سرپرست) ایذارسانی سے باز نہیں آئیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلے گا کہ خاموش اکثریت اس جماعت کے حق میں ہموار ہوتی چلی جائے گی اور یہ چیز بھی درحقیقت اس انقلابی نظریہ اور فکر کے پھیلنے میں ایک اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔"[43]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکی زندگی میں یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ صحابہ کرامؓ کو ظلم کے مقابلے میں ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی جس کے نتیجے میں خاموش اکثریت کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ ہو گئیں۔ دور حاضر میں ایرانی انقلاب کے موقع پر امام خمینی کی پالیسی بھی یہی تھی جس کے نتیجے میں شاہ ایران کو ملک چھوڑنا پڑا۔ تنظیم اسلامی کا عدم تشدد کا نظریہ زمینی حقائق کے مطابق اور سنت نبوی ﷺ سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ تنظیم ابھی تک ایسے رفقاء تیار کرنے میں ناکام رہی ہے جو ظلم جھیل سکیں۔ اس ناکامی کی سب سے بڑی وجہ لوگوں کا قرآن سے لاتعلق ہونا ہے۔ تنظیم اسلامی نے اپنی دعوت کا ذریعہ قرآن کو بنایا ہے جبکہ دورِ حاضر کا مسلمان قصے کہانیاں سننے میں لطف محسوس کرتا ہے اور

[43] حوالہ سابق، ص ۱۳۔

قرآن سے دور بھاگتا ہے جس کی وجہ سے تنظیم اپنے مقاصد میں تاحال ناکام نظر آتی ہے۔

پانچواں مرحلہ: اقدام اور چیلنج

ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے یہ ہے کہ جب طاقت اتنی فراہم ہو جائے کہ وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کر لے کہ اب ہم کھلم کھلا اور برملا اس غلط نظام کو چیلنج کر سکتے ہیں اور اس نظام کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو اس مرحلہ پر صبر محض اپنے اگلے مرحلے یعنی اقدام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب حکمت عملی یہ ہو گی کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو[44]

کسی انقلاب کے لئے راست اقدام (Active Resistance) کا فیصلہ بہت نازک (crucial + critical) ہوتا ہے۔ نظری طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ راست اقدام کا فیصلہ قبل از وقت ہو جائے گا تو دنیوی اعتبار سے انقلاب ناکام ہو جائے گا۔ اگر تعداد معتدبہ نہیں ہے، اگر تربیت خام رہ گئی ہے تو دنیاوی ناکامی کا سامنا ہو گا۔ جس طرح مصر میں اخوان المسلمون کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا یہ بڑا نازک لمحہ ہوتا ہے۔ اور انقلابی جماعت کی قیادت کا کڑا امتحان ہوتا ہے۔ جماعت کے امیر کے صحیح یا غلط فیصلے پر ہی انقلاب کے کامیاب یا ناکام ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔

چھٹا مرحلہ: مسلح تصادم

اقدام اور چیلنج کے نتیجہ میں چھٹا اور آخری مرحلہ شروع ہو گا اور وہ ہے مسلح تصادم۔ جب تک وہ انقلابی جماعت اقدام نہیں کر رہی تھی یعنی ماریں کھا رہی تھی اور ہاتھ نہیں اُٹھا رہی تھی، تب تک اور بات تھی۔ اگر اس جماعت نے بھی ہاتھ اُٹھالیا تو وہ نظام اس پر پوری طاقت اور قوت کے ساتھ حملہ آور ہو گا اور یہ ہے وہ آخری مرحلہ (Final Phase) جس کے اندر جسمانی ٹکراؤ (Physical collision) ہو کر رہتا ہے۔ اس کے لئے مسلح تصادم (Armed conflict) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب یہ چھٹا مرحلہ شروع ہو جائے تو فریقین کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ اب تو تاریخ بتائے گی، حالات فیصلہ کریں گے اور نتیجہ تخت یا تختہ کی صورت میں برآمد ہو گا۔ اگر پہلے پانچ مراحل صحیح طور پر طے ہوئے ہیں۔ مستحکم ہوتے ہوئے اور consolidate کرتے ہوئے وہ انقلابی عمل آگے بڑھا ہے۔ صحیح تربیت ہوئی ہے، صحیح تنظیم ہوئی ہے اور خاص طور پر یہ بات کہ پہلے پانچوں مراحل

[44] حوالہ سابق، ص ۱۴۔

کو طے کرنے کا صحیح حق ادا کیا گیا ہے تو انقلابی جماعت کامیاب ہو جائے گی، انقلاب وقوع پذیر ہو جائے گا اور اس انقلابی نظریہ کے مطابق نظام یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ ورنہ اسے کچل کر رکھ دیا جائے گا۔

انقلاب کی توسیع و تصدیر

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق اگر انقلاب کامیاب ہو جائے تو ایک ساتواں مرحلہ (Seventh Phase)اور شروع ہو گا۔ چھ مراحل سے تو کسی ایک ملک میں انقلاب کی تکمیل ہوتی ہے۔ ساتواں مرحلہ اس انقلاب کی توسیع کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایک نظریاتی انقلاب کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جغرافیائی اور قومی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ ایک فکر، ایک فلسفہ، ایک نظریہ کی بنیاد پر آتا ہے اور نظریہ وہ شے ہے کہ اس کے لئے نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہے نہ ویزا کی حاجت ہے۔ نظریہ کے لئے سرحدیں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ اگر نظریہ میں جان ہے تو وہ دوسرے ممالک میں اپنی جڑیں قائم کرے گا۔ جس کے نتیجہ میں انقلاب کی توسیع ہو گی اور وہ پھیلے گا۔ جیسے انقلاب فرانس، فرانس تک محدود نہیں رہا۔ بالشویک ریوولیوشن(Revolution)یعنی اشتراکی انقلاب صرف روس تک محدود نہیں رہا۔ انقلاب کا یہ خاصہ ہے کہ پہلے کسی ایک ملک اور کسی ایک علاقے میں آتا ہے۔ وہاں اس کے ثمرات کا ظہور ہوتا ہے پھر اس کی بین الاقوامی سطح پر توسیع کا عمل شروع ہوتا ہے[45]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اسلامی انقلاب کے جو مراحل بیان کئے ہیں وہ اُن کے نزدیک سیرت نبوی ﷺ سے ماخوز ہیں۔ دور حاضر میں انقلاب کیسے لایا جا سکتا ہے؟اس ضمن میں مسلح تصادم کے اعتبار سے دور نبویؐ اور موجودہ دور میں حالات کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب فرق کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک پہلا واضح ترین اور نمایاں ترین فرق تو یہ واقع ہوا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ایک خالص کافرانہ اور مشرکانہ معاشرے میں ہوئی تھی جبکہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق ایک مسلمان معاشرہ سے ہے اور ہمیں اس میں کام کرنا ہے۔ ہمارے ملک ہی کی طرح دوسرے بہت سے مسلم ممالک ہیں جن میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد اسی فیصد سے زائد ہے اور ان تمام ممالک کے سربراہ اور حکمران بھی مسلمان ہی ہیں۔ رعایا اور حکمرانوں کے کردار، اُن کے اخلاق، اُن کی سیرت اور دین سے اُن کے عملی تعلق کے معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ سب کے

---

[45] حوالہ سابق، ص۸۔۱۵۔

سب قانوناً مسلمان ہیں۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کہیں بھی مکمل اسلامی نظام اپنی آئیڈیل صورت میں عملاً قائم ونافذ نہ ہو بلکہ پورا کا پورا لادینی (Secular) نظام رائج ہو تب بھی وہ مسلمان معاشرہ کہلائے گا اور اس کے حکمران مسلمان ہی تسلیم کئے جائیں گے۔ پھر حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان معاشروں میں کردار کے اعتبار سے ہر طرح کے طبقات موجود ہیں۔ شرابی، زانی، قمارباز اور کئی اعتبارات سے صرف اسلامی اخلاق و کردار ہی سے نہیں، عام انسانی سیرت و کردار سے تہی دست افراد بھی موجود ہیں اور اسلامی نظام کے عملاً نافذ نہ ہونے کے باوجود انہی معاشروں میں کچھ نہ کچھ ایسے مسلمان بھی لازماً موجود ہوں گے جو غازی، روزے دار، اسلامی شعائر کی پاسداری کرنے والے اور انفرادی سطح پر صالح اور متقی مسلمان ہوں۔ جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حالات یکسر مختلف تھے۔ چنانچہ ہمارے دور اور دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ پہلا اور بنیادی فرق ہے۔

دوسرا فرق:۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوع انسانی کا جو تمدنی ارتقا ہوا ہے، اس کے اعتبار سے اب کسی بھی ملک میں جو حکومت ہوتی ہے اس کے پاس تمام وسائل ہوتے ہیں۔ اور تمام قوت ہوتی ہے پھر ان دونوں کا نہایت منظم ارتکاز ہوتا ہے۔ جبکہ عوام بالکل نہتے ہو گئے ہیں۔ حکومت اور عوام کے مابین فرق و تفاوت اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ مسلح تصادم (Armed conflict) والا مرحلہ قریباً ناممکن کے درجہ تک پہنچ چکا ہے[46]۔

مندرجہ بالا دو تبدیلیوں کی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک انقلاب کے مراحل میں اجتہادی بصیرت کے ذریعے لائحہ عمل میں کچھ تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔ اب اسلامی انقلاب کے لئے اقدام کا واحد راستہ صرف یہ ہے کہ اگر ایک ایسی تنظیم وجود میں آجائے جو پہلے چار مراحل یعنی دعوت، تنظیم، ترتیب اور صبر محض سے گزر چکی ہو تو وہ رائج الوقت نظام اور اس کو چلانے والے انتظامی ادارے (یعنی حکومت کے مقابلہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کمر کس لے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر کھڑی ہو جائے اور صرف زبانی و کلامی بات کرنے کے بجائے علی الاعلان یہ کہے کہ اب فلاں فلاں منکر کام ہم ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کام اب ہماری لاشوں پر ہو گا۔ پھر اس پر ڈٹ جائے اور ہر نوع کی مالی و جانی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کرے۔ البتہ اس اقدام میں اس بات کا التزام و لحاظ

---

46 حوالہ سابق، ص ۳۴۵۔۳۴۶۔

ضروری ہو گا کہ انہی منکرات کو چیلنج کیا جائے جو تمام مسالک کے ماننے والوں کے نزدیک مسلّم ہوں۔ کسی مسئلہ میں اگر کسی کی شاذ رائے ہو کہ وہ منکر ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس پر تو تمام مسالک کے لوگوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر کوئی تحریک ہی برپا کی جا سکتی ہے۔ ہدف اس کام کو بنانا ہو گا جو سب مسلمانوں کے نزدیک منکر ہو، جو سب کے نزدیک حرام ہو۔ مثال کے طور پر بے حیائی، عریانی، تبرّج جاہلیہ، مرد و عورت کے مخلوط اجتماعات کے سارے طور طریقے، عورت کی بطور اشتہار تشہیر اور یوم پاکستان اور یوم استقلال کے مواقع پر فوج کے ساتھ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی معنوی نوجوان بیٹیوں کی سڑکوں پر مردوں کے سامنے سینہ تان کر پریڈ وغیرہ۔

موجودہ دور میں اسلامی انقلابی جماعت منکرات یعنی خلاف شریعت کاموں کے خلاف مظاہروں کے ذریعے اقدام کا آغاز کرے گی۔ تمدنی ارتقاء نے ان مظاہروں کی بہت سی صورتوں سے دنیا کو روشناس کرایا ہے جن میں پکٹنگ یعنی دھرنا مار کر بیٹھنا، احتجاجی طور پر حکومت کو یا عوام کو کسی کام سے روکنے کے لئے گھیراؤ وغیرہ کرنا بھی شامل ہے۔

اقدام کے لئے لازمی شرائط

دور حاضر میں جب ایک جماعت دعوت، تنظیم، تربیت اور صبر محض کے بعد اقدام کے مرحلے پر پہنچے گی تو اُسے اپنی طرف سے ہاتھ بالکل نہیں اُٹھانا ہے۔ کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہیں کرنی ہے۔ مکی زندگی میں صحابہ کرامؓ نے ہر قسم کے جور و ستم کو پامردی سے برداشت کیا، اپنی طرف سے جوابی کاروائی تو درکنار مدافعت تک نہیں کی۔ وہی طرز عمل اس اقدام یعنی مظاہروں، گھیراؤ وغیرہ کے معاملہ میں اس انقلابی جماعت کو اختیار کرنا ہو گا۔ یہ نہیں کہ احتجاجی جلوس تو تنظیم اسلامی نکالے لیکن توڑ پھوڑ کوئی اور کر جائے۔ اگر انقلابی جماعت کے اثرات اتنے نہیں ہیں کہ وہ عوام کو پر امن رکھ سکے اور نہ اس کے پاس ایسے کارکن ہیں جو عوام کو کنٹرول کر سکیں اور ہر نوع کی بدامنی کو قابو میں رکھ سکیں تو ایسی صورت میں مظاہروں کا اس تنظیم کو حق نہیں ہے۔ اس اقدام کا مرحلہ اس وقت آئے گا کہ جب اس انقلابی جماعت کو اپنی امکانی حد تک یہ اندازہ اور معلومات حاصل ہوں کہ ہمارے اپنے زیر اثر اور ہمارے تربیت یافتہ لوگ اتنے ہیں کہ وہ پر امن طریق پر سڑکوں پر آ سکتے ہیں اور مظاہرے کر سکتے ہیں اور اُن کی اخلاقی ساکھ اتنی مضبوط ہے کہ اُن کے مظاہروں کے دوران بدامنی کا کوئی حادثہ نہیں ہو گا۔ اور اگر چند شر پسند لوگ

بدامنی پر اُتر ہی آئیں تو ان کی تنظیمی طاقت اتنی مضبوط ہو کہ تنظیم کے کارکن اُن اشرار کی گردنیں دبو چیں۔ اس کے بجائے کہ حکومت کی انتظامیہ کو ان کی گردنیں دبوچنے کی ضرورت پیش آئے وہ خود ان پر قابو پا کر انہیں حکومت کے حوالے کریں کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ یہ تخریب کار عناصر ہیں جو اس پر امن اور عدم تشدد کی اسلامی تحریک کو سبوتاژ اور درہم برہم کرنے کے لئے آ گئے ہیں۔ اس انقلابی تنظیم کے تربیت یافتہ جلوس نہ بسوں کو جلائیں گے نہ نیون سائنوں اور ٹریفک سگنلوں کو توڑیں گے نہ ہی وہ کسی نجی یا سرکاری املاک کو نقصان پہنچائیں گے۔ ان جلوسوں اور مظاہروں کا مطالبہ یہ ہو گا کہ فلاں فلاں کام شریعت کی رو سے منکر ہیں، حرام ہیں۔ ہم ان کو کسی حال میں نہیں ہونے دیں گے۔ حکومت گرفتار کرے تو مظاہرین کوئی مذاحمت نہیں کریں گے۔ لاٹھی چارج کرے تو اُسے جھیلیں گے۔ آنسو گیس کے شیل برسائے تو برداشت کریں گے حتیٰ کہ گولیاں برسائے تو خوشی خوشی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے لیکن نہ پیچھے ہٹیں گے اور نہ اپنے مؤقف کو چھوڑیں گے[47]۔

تین ممکنہ نتائج

ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک اسلامی انقلاب کے محولہ بالا طریقہ کار کے تین ممکنہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اگر ان مظاہروں کے نتیجہ میں پسپائی اختیار کرے، یعنی منکرات کو ختم کرنا شروع کر دے تو ہمیں اور کیا چاہیے، ایک منکر کے بعد دوسرا منکر، دوسرے کے بعد تیسرا منکر۔ اگر ہم ایک ایک کر کے منکرات کو ختم کراتے چلے جائیں تو اسلامی انقلاب آجائے گا، تبدیلی برپا ہو جائے گی۔ لیکن جب تک نظام مکمل طور پر اسلامی نہیں ہو گا یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

دوسرا ممکنہ نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت وقت اسے اپنی بقاء، اپنی انا اور اپنے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ بنا لے اور طاقت سے اس اسلامی تحریک کو کچلنے کی کوشش کرے۔ اس موقع پر ذرا ٹھہر کر حکومت وقت کی ماہیت وہیت کو سمجھ لیجئے کہ وہ کیا ہوتی ہے۔ ہر حکومت کسی نہ کسی طبقہ کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے۔ وہ معاشرہ کے کسی طاقتور طبقہ کے مفادات کی محافظ بن کر بیٹھی ہوتی ہے، اسلام کا نظام عدل وقسط ان طبقات کے لئے پیغام موت لے کر آتا ہے۔ لہٰذا حکومت وقت کسی ایسی تحریک کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتی جس کے کامیاب ہونے کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ استحصالی نظام

---

[47] حوالہ سابق، ص ۳۶۴-۳۶۶۔

ختم ہو جائے اور اسلام کا عادلانہ و منصفانہ نظام قائم و نافذ ہو جائے۔ لہٰذا وہ ریاست کی پولیس اور فوج کو اس تحریک کو کچلنے کے لئے بے دریغ استعمال کرے گی۔ لاٹھاں برسیں گی، آنسو گیس کے شیل پھینکے جا ئیں گے۔ لیکن اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان تک دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی! جیلوں میں کتنی گنجائش ہو گی! کتنوں کو پھانسیاں دے گی۔ اگر تحریک کے کارکنوں نے صبر و ثابت قدمی کا ثبوت دیا تو میں (ڈاکٹر اسرار احمد) پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی ہم مذہب اور ہم وطن ہیں۔ ہمارے ہی اعزا و اقربا ہیں۔ یہ لوگ اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے میدان میں نہیں آئے ہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے نفاذ کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے نکلے ہیں تو آخر کب تک ان کو اپنی گولیوں سے بھونتے چلے جائیں!! نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائے گا اور تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو گی۔ تو یہ دو ممکنہ صورتیں تو تحریک کی کامیابی کی ہیں۔

ایک تیسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ حکومت وقت اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے، تو جن لوگوں نے اس راہ میں جانیں دی ہوں گی، ان کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر عظیم اور فوز کبیر سے نوازے جائیں گے۔ انشا اللہ العزیز۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں البتہ اس کو بدلنے کی جدوجہد ہم پر فرض ہے۔ مزید برآں انہی جان نثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے انشاء اللہ جلد یا بدیر کوئی نئی انقلابی اسلامی تحریک ابھرے گی جو طاغوتی استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی اور اس طرح وہ وقت آکر رہے گا جس کی خبر الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ پورے کرہ ارض پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپ صلی علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا[48]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے بیان کردہ منہج انقلاب نبویؐ سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس انداز سے اگر دین کا کام کیا جائے تو طویل مدت کے بعد انقلاب کی امید کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک صبر آزما عمل ہے جس میں صدیاں بھی بیت سکتی ہیں۔ ایک انسان کا کام کوشش کرنا ہے۔ نتائج اللہ رب العزت

---

[48] حوالہ سابق، ص ۳۸۲۔۳۸۳۔

کے ہاتھ میں ہیں۔ دینی تحریکوں سے یہ بہت بڑی غلطی ہوتی رہی ہے کہ وہ فوری نتائج کے حصول کے لئے غیر اسلامی اقدامات بھی اُٹھالیتی ہیں جس کے نتیجے میں انقلاب کی منزل قریب کی بجائے مزید دور ہو جاتی ہے۔ دور حاضر میں لال مسجد اسلام آباد کی انتظامیہ نے شریعت کے نفاذ کی تحریک چلائی اور جب قانون ہا تھ میں لینے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ انتہائی بھیانک نکلا اور اس تحریک کے قائد مولانا عبد العزیز برقعہ پہن کر مسجد سے فرار ہوتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے انقلاب کا جو طریقہ بتایا ہے، وہی معقول طریقہ ہے۔

قیام پاکستان کی غرض وغایت اور بانی تنظیم کا نظریہ

ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تقاریر میں اس بات کا ذکر شدومد کے ساتھ کرتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا اس کے علاوہ پاکستان کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ اُن کے نزدیک برصغیر کے عوام الناس یہ چاہتے تھے کہ ہم ایک خطہ زمین حاصل کریں تاکہ وہاں اسلامی نظام نافذ کر سکیں۔

ہفت روزہ ندائے خلافت میں اپنے خصوصی مضمون "زمینی حقائق اور پاکستان کا مستقبل" میں ڈاکٹر اسرار احمد یوں رقمطراز ہیں

"راقم الحروف ایک عرصہ سے اس چیز کی منادی دے رہا ہے کہ پاکستان کی وجہ جواز اسلام کے سوا کچھ نہیں اور ہم نے اسلام کی جانب پیش رفت نہ کرکے اپنی وجہ جواز کو کھو دیا ہے"[49]۔

ڈاکٹر صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد چونکہ مسلمانوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہو ے اس عہد کی پاسداری نہیں کی جو قیام پاکستان سے قبل کیا گیا تھا، اسی لئے ۲۵ سال بعد ہمیں سزا ملی اور پا کستان کا ایک حصہ ہم سے علیحدہ ہو

کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اس سے قبل کہ ڈاکٹر صاحب کے نظریے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ایک اور مضمون سے ایک تفصیلی اقتباس نقل کر دیا جائے، تاکہ اُن کی رائے وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجائے۔ یہ مضمون "ملت اسلامیہ پاکستان کی خصو صی ذمہ داری" کے عنوان سے اُن کی کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل

[49] ڈاکٹر اسرار احمد، زمینی حقائق اور پاکستان کا مستقبل، ہفت روزہ ندائے خلافت، لاہور، اشاعت ۸ تا ۱۴ مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۸۔

اور مسلمانان پاکستان کی خصوصی ذمہ داری" میں شامل ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء تا۱۹۳۸ء) اور قائد اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء تا۱۹۴۸ء) کے حوالے سے بھی یہ کہا ہے کہ وہ ایک ایسا خطہ چاہتے تھے جہاں اسلام نافذ ہو۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "اوراب توجہ فرمایئے تاریخ کی اس کروٹ کی جانب جس کے نتیجے میں اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملت اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر آ گیا ہے۔ یہ کروٹ تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں قیام پاکستان سے عبارت ہے جس کا اعلانیہ مقصد اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا قیام اور پورے عالم انسانیت کے سامنے اسلام کے اصول حریت واخوت ومساوات کا ایک نمونہ پیش کرنا تھا۔ چنانچہ مفکر ومصور پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنے خطبہ الہٰ آباد (۱۹۳۰ء) میں فرمایا تھا کہ "مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیر مبرم ہے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو پردے عرب ملوکیت (امپریلزم) کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر دوبارہ اصل اسلام کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں" اور بانی ومعمار پاکستان محمد علی جناح نے بھی بارہا ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا اور قیام پاکستان کی صورت میں غالب اور جارح ہندو اکثریت کے ملک بھارت میں شامل رہ جانے والے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی، چنانچہ ان سطور کے راقم کو پوری شدت کے ساتھ یہ احساس لاحق ہے کہ ہم بحیثیت ملت اسلامیہ پاکستان اللہ کے قانون عذاب کی گرفت میں آ چکے ہیں اور اس عظیم قانون کی اس دفعہ کے مطابق جو سورہ سجدہ کی آیت ۲۱ میں وارد ہوئی ہے، یعنی "ہم انہیں بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزہ ضرور چکھائیں گے، شائد کہ یہ لوٹ آئیں!" ہماری پیٹھ پر عذاب الٰہی کا ایک شدید کوڑا ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کی صورت میں قلب ماہیت اور سب سے بڑھ کر ایک ذلت آمیز اور عبرت ناک شکست کی صورت میں پڑ چکا ہے"[50]۔

محولہ بالا اقتباس کے ذریعے ڈاکٹر صاحب کا موقف وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ اس نقطہ نظر میں ایک بہت بڑا جھول نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو تنظیم اسلامی میں منہج انقلاب نبوی ﷺ کا تذکرہ بڑی شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف ڈاکٹر اسرار احمد قیام پاکستان کی جدوجہد کو

[50] ڈاکٹر اسرار احمد، سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری، مکتبہ انجمن خدام القرآن، لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۵ء، ص ۲۰۔

اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ وہ لوگ جن کی کوششوں سے پاکستان بنا، انہوں نے اس جدوجہد میں نبوی طریق اختیار نہیں کیا اور نہ ہی تحریک پاکستان کے کارکنوں میں وہ تقویٰ موجود تھا جو کہ ایک اسلامی تحریک کے کارکنوں کے لئے جزولاینفک ہے۔ پھر کیوں ڈاکٹر اسرار احمد اور اُن کے رفقاء مصر ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا؟ اس نقطہ نظر کے بغیر کیا پاکستان میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد نہیں ہو سکتی؟ محمد اسحاق بھٹی نے اپنی کتاب بزم ارجمند اں میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک قلمی خاکہ لکھا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے چند سوالات اُٹھائے ہیں جو یہاں بے کم وکاست درج کئے جاتے ہیں۔

محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ میں ڈاکٹر صاحب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر قیام پاکستان کا یہی مقصد تھا اور اس میں اسلام کا نفاذ ہی مطلوب تھا تو

(۱) کیا وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی یا اس کی جنرل کونسل کے کسی ایسے فیصلے یا ریزولیوشن کی نشاندہی کر سکتے ہیں جس میں یہ وضاحت کی گئی ہو کہ پاکستان اسلام کے لئے بنایا جا رہا ہے۔ اور اس میں اسلامی نظام نافذ ہو گا؟

(۲) کیا اس دور کے کسی سرکردہ مسلم لیگی رہنما نے یہ بتایا کہ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے اور ہم اسے کس طرح ملک میں نافذ کریں گے؟

(۳) ہندوستان اس وقت گیارہ صوبوں پر مشتمل تھا۔ کیا کسی صوبائی مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اس طرح کا کوئی ریزولیوشن یا فیصلہ ڈاکٹر صاحب یا کسی اور صاحب کے علم میں ہے جس میں اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں کوئی بات کی گئی ہو؟

(۴) کیا مسلم لیگ کے اکابر (یعنی قائد اعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خاں، خواجہ ناظم الدین، سید حسین شہید سہروردی، سردار عبد الرب نشتر، چوہدری خلیق الزمان اور اسماعیل ابراہیم چند دیگر وغیرہ) حضرات میں سے کسی لائق احترام شخصیت کی ایسی تقریر یا تحریر موجود ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہو کہ اس ملک میں اسلام نافذ ہو گا اور اسلام ہی کی حکمرانی ہو گی؟

(۵) کیا آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے کوئی ایسے بزرگ بھی رکن تھے جنھیں باقاعدہ

عالم دین کہا جاتا ہو ؟[51]۔

محمد اسحاق بھٹی نے جو نکات اُٹھائے ہیں۔ وہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک اور بات جو عوام الناس کے ذہنوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں یہ نعرہ زبان زد عام تھا" پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالہ الا اللہ" یہ الفاظ اس بات کی دلیل سمجھے جاتے ہیں کہ پاکستان اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کیا یہ الفاظ مسلم لیگ کے منشور میں داخل تھے؟ یا مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن کا حصہ تھے؟ یا قائداعظم محمد علی جناح یا کسی سرکردہ مسلم لیگی نے یہ نعرہ لگایا تھا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح نے بے شمار مواقع پر اسلامی نظام کی بات کی تھی۔ لیکن قیام پاکستان کے لئے وہ اسوہ اختیار نہیں کیا گیا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے ہیں اور جس کی وکالت ڈاکٹر اسرار احمد اپنی کتاب منہج انقلاب نبوی ﷺ میں بڑی وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی اس بات سے اتفاق کرنا انتہائی مشکل ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا۔ اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ سیاستدانوں نے اَن پڑھ اور بے عمل سادہ مسلمانوں کو اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کیلئے اسلام کا نام استعمال کیا۔ ہماری یہی منافقت ہے جس کی سزا ۷۰ سال سے ہمیں مل رہی ہے۔ محمد اسحاق بھٹی کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ:

"ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے کہ قیام پاکستان کا مقصد اسلام تھا یا نہیں تھا۔ بات صرف یہ کرنی چاہیے کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اور یہاں کے مسلمانوں کا مطمع نظر اس میں اسلام کا نفاذ ہے۔ لہٰذا اسے اسلام کے حوالے کر دینا چاہیے"[52]

اگر تنظیم اسلامی مندرجہ بالا موقف اختیار کر لے تو فکری تضاد سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔

---

[51] محمد اسحاق بھٹی، بزم ارجمنداں، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، سن اشاعت ۱۹۹۹ء، ص ۵۸۷۔۵۸۸۔

[52] حوالہ سابق، ص ۵۸۹۔۵۹۰۔

دوسرا باب: تحریک ختم نبوت

مرزا غلام احمد کے حالات زندگی

پیدائش

مرزا غلام احمد (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۰۸ء) کی پیدائش سکھ حکومت کے آخری عہد میں پنجاب ضلع گورداسپور کے ایک قصبے قادیان میں ہوئی۔ یہ قصبہ امرتسر کے شمال مشرق میں ریلوے لائن پر ایک پرانے شہر بٹالہ سے صرف گیارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مرزا کی تاریخ پیدائش اگرچہ صاف اور واضح نہیں تاہم اُن کی اپنی کتابوں میں پیدائش کے بارے میں تذکرہ موجود ہے۔ جس کے بارے میں وہ خود یوں بیان کرتا ہے۔

"اب میرے ذاتی سوانح یہ ہیں کہ میری پیدائش ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں سکھوں کے آخری وقت میں ہوئی اور میں ۱۸۵۷ء میں سولہ سترھویں برس میں تھا۔ ابھی ریش و بروت کا آغاز نہیں ہوا تھا"[53]۔

سن پیدائش کے بارے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ مرزا بشیر الدین محمود نے جو سپاسنامہ ۱۹۲۲ء میں حکومت برطانیہ کو پیش کیا تھا اس میں اس نے مرزا غلام احمد کا سن ولادت ۱۸۳۶ء تحریر کیا ہے جس حساب سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت مرزا کی عمر ۲۱ برس بنتی ہے۔ شیخ محمد اکرام نے مرزا کی تاریخ پیدائش ۱۸۳۷ء تحریر کی ہے[54]۔

تعلیم

مرزا نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی۔ بچپن کے زمانے میں اس کی تعلیم کچھ اس طرح سے ہوئی کہ جب وہ چھ سال کا ہوا تو ایک فارسی معلم رکھا گیا جس نے قرآن شریف اور چند فارسی کتابیں مرزا کو پڑھائیں۔ اس کے بعد ایک عربی خواں مولوی اس کی تربیت کے لئے مقرر کئے گئے۔ ایک شیعہ عالم مولوی گل علی شاہ سے فلسفہ، منطق اور حکمت کی کتابوں کا درس لیا اور بعض طبابت کی کتابیں مرزا نے اپنے والد سے پڑھیں۔ لیکن یہ سلسلہ تدریس ادھورا رہا جس کی وجہ مرزا کچھ یوں تحریر کرتے ہیں:

---

53 غلام احمد، کتاب البرید، قادیان، باردوئم، دسمبر ۱۹۳۲ء، ص ۱۳۴، ۱۳۵۔

54 شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷۷۔

"ان دنوں مجھے کتابوں کو دیکھنے کی طرف اس قدر توجہ تھی کہ گویا میں دنیا میں نہ تھا۔ میرے والد مجھے بار بار یہی ہدایت کرتے تھے کہ کتابوں کا مطالعہ کم کرنا چاہیے کیونکہ وہ نہایت ہمدردی سے ڈرتے تھے کہ صحت میں فرق نہ آوے۔ نیز اُن کا مطلب یہ بھی تھا کہ میں اس شغل سے الگ ہو کر ان کے غموم وہموم میں شریک ہو جاؤں۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ میرے والد اپنے آباؤ اجداد کے دیہات دوبارہ لینے کے لئے انگریز عدالتوں میں مقدمات کر رہے تھے۔ انہوں نے ان ہی مقدمات میں مجھے بھی لگا دیا۔ ایک زمانہ دراز تک میں ان کاموں میں مشغول رہا۔ مجھے افسوس ہے کہ بہت سا وقت عزیز میرا ان بے ہودہ جھگڑوں میں ضائع ہو گیا۔ اس کے ساتھ والد موصوف نے زمینداری امور کی نگرانی میں مجھے لگا دیا۔ میں اس طبیعت اور فطرت کا آدمی نہیں تھا"[55]۔ مرزا صاحب اپنی ایک اور کتاب میں یوں لکھتے ہیں:

"حالت فاسدہ زمانہ کی یہی چاہتی ہے کہ ایسے گندے زمانے میں جو امام الزمان آوے وہ خدا کے حکم سے مہدی ہو اور دینی امور میں کسی کا شاگرد نہ ہو اور نہ کسی کا مرید ہو اور عام علوم و معارف خدا سے پانے والا ہو، نہ علم دین میں کسی کا شاگرد ہو اور نہ کسی کا مرید ہو اور عام علوم و معارف خدا سے پانے والا ہو، نہ علم دین میں کسی کا شاگرد ہو اور نہ امور فقر میں کسی کا مرید"[56]۔

ملازمت

مرزا غلام احمد نے اپنے دوست لالہ بھیم سین کی مدد سے ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے دفتر میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازمت شروع کی۔ ایک دفعہ مرزا غلام احمد کو معلوم ہوا کہ لالہ بھیم سین مختاری کا امتحان دے رہا ہے تو مرزا نے بھی امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ دونوں نے اکٹھا امتحان دیا مگر کامیاب صرف لالہ بھیم سین ہوا۔ جس کے بعد جلد ہی مرزا نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ملازمت کی عمر چار سال تھی۔ دوران ملازمت مرزا کو انگریزوں نے استعمال کیا اور قادیانی مذہب کا پرچار شروع کروایا[57]۔

مرزا غلام احمد کی وفات

مرزا نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو علماء اسلام مرزا غلام احمد کی جھوٹی نبوت کے سامنے آہنی

55 غلام احمد، کتاب البرید، ص۲۸۔
56 غلام احمد، کتاب البرید، ص۲۸۔
57 ابو مدثرہ، قادیان سے اسرائیل تک، عالمی مجلس احرار اسلام، پاکستان، ملتان، ۱۹۸۹ء، ص۲۷۔

دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ مرزا غلام احمد نے علماء کے مقابلے میں ایک چال چلی۔ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ کو ایک اشتہار جاری کیا جس میں فیصلہ خدا کے ہاتھ چھوڑا کہ وہی اسی دنیا میں جھوٹے اور سچے کو ثابت کرے گا اور جھوٹا سچے کی زندگی میں طاعون، ہیضہ جیسے مرض میں مبتلا ہو کر مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سچ کو ثابت کیا اور اشتہار کے ایک سال بعد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ کو مرزا غلام احمد اسہال کی بیماری میں مبتلا ہو کر بمقام لاہور وفات پا گیا۔ مرزا بشیر احمد اپنے والد کی وفات سے متعلق لکھتا ہے:

"حضرت مسیح موعود ۲۵ مئی ۱۹۰۸ء یعنی پیر کی شام کو بالکل اچھے تھے۔ رات کو عشاء کی نماز کے بعد خاکسار باہر سے مکان میں آیا تو میں نے دیکھا کہ آپ والدہ صاحبہ کے ساتھ پلنگ پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ میں اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا اور پھر مجھے نیند ہو گئی۔ رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب مجھے جگایا گیا یا شاید لوگوں کے چلنے پھرنے اور بولنے کی آواز کی سے میں خود بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اسہال کی بیماری سے سخت بیمار ہیں اور حالت نازک ہے اور اِدھر اُدھر معالج اور دوسرے لوگ کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جب میں نے پہلی نظر حضرت مسیح موعود پر ڈالی تو میرا دل بیٹھ گیا کیونکہ میں نے ایسی حالت آپ کی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اور میرے دل پر یہی اثر پڑا کہ یہ مرض الموت ہے۔"[58]

مرزا غلام احمد کی وفات نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ جھوٹا سچے کی زندگی میں ہی گزر گیا۔ مرزا اشتہار کے ایک سال بعد ہی مر گیا۔ جبکہ مولانا ثناء اللہ امرتسری جنہوں نے مرزا غلام احمد کا ناطقہ بند کر رکھا تھا اور جن کو خاموش کرنے کے لئے مرزا نے اشتہار دیا تھا، مرزا کی وفات کے بعد تقریباً ۴۰ سال تک زندہ رہے (آپ نے ۱۹۴۸ء میں وفات پائی)۔

دعوت غلام احمد کا تدریجی ارتقاء

اُنیسویں صدی کی تاریخ اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتی تھی کہ اسلامی ممالک میں سیاسی انتشار، دماغی بے چینی اور اندرونی کشمکش اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ہندوستان اس بے چینی و کشمکش کا خاص میدان تھا۔ یہاں بیک وقت مغربی و مشرقی تہذیبوں، جدید، قدیم نظام تعلیم، نظام فکر اور اسلام و مسیحیت میں معرکہ کارزار گرم تھا۔ دونوں طاقتیں زندگی کے لئے ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں۔

---

58 بشیر احمد، سیرت المہدی، احمدیہ کتاب گھر قادیان، اشاعت دوئم، ۱۹۳۵ء، جلد اوّل، ص ۷۔

۱۸۵۷ء کی آزادی کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے دل شکست کے صدمہ سے زخمی اور اُن کے دماغ ناکامی کی چوٹ سے مفلوج ہو رہے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے عیسائی پادری مسیحیت کی دعوت و تبلیغ میں خاص سرگرمی دکھارہے تھے۔ مسلمانوں کی نئی نسل جس پر اسلامی تعلیمات نے پورے طور پر اثر نہیں کیا تھا، اس دعوت و تلقین کا خاص طور پر ہدف تھے۔ دوسری طرف فرق اسلامیہ کا آپس کا اختلاف تشویشناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ سارے ہندوستان میں مذہبی خانہ جنگی سی برپا تھی۔ اس سے علماء کے وقار اور دین کے احترام کو بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ ان حالات میں انگریز ایک منصوبے کے تحت ہندوستان کے مسلمانوں کو مایوسی و ناکامی، اختلاف اور نفاق کے جس مقام تک لے جانا چاہتے تھے، لے گئے۔ جس کے بعد انگریز نے مسلمانوں کے اس عقیدے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ قربِ قیامت میں مسیح موعود نے آنا ہے۔ پنجاب کے ایک دوست خاندان کے ایک فرد غلام احمد کو چن کر مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرایا۔ پنجاب کو خاص طور پر اس لئے چنا گیا کیونکہ انگریز اس حقیقت سے واقف تھا کہ پنجاب پر ۸۰ سالہ سکھ دور اقتدار نے مسلمانوں میں مایوسی، ذہنی انتشار اور ضعیف الاعتقادی پیدا کر دی تھی۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی معاشرے کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں یہی وجہ تھی کہ مرزا غلام احمد کو اپنی تاویلی نبوت چمکانے لے لئے یہاں سے آب و دانہ میسر آ گیا۔

مرزا غلام احمد نے انگریزوں کے ایماء پر دعویٰ نبوت کر کے مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپنے کی جسارت کی اور روح محمد ﷺ چھیننے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ نبوت کی دعویٰ دار نے ایک دم دعویٰ نہ کیا بلکہ اس نے تدریجی ارتقاء کے ذریعے اپنی تعلیمات پھیلا کر اپنے آپ کو نبوت کے درجے پر پہنچایا۔ ذیل میں مرزا غلام احمد جو اپنے آپ کو مصنف، مبلغ، مجدد، محدث، مسیح موعود، ظلی بروزی نبی اور آخر کار نبوت کے اعلیٰ شان و مرتبے پر پیش کرتا ہے، کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی بطور مصنف

مرزا غلام احمد ۱۸۶۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر قادیان آ گیا لیکن قادیان میں بھی ان کے کرنے کو کچھ نہ تھا جس سے ان کا دل اپنے ماحول سے اچاٹ ہو گیا۔ قادیان سے مرزا اپنے دوست مولانا محمد حسین بٹالوی کے پاس بٹالا آئے اور ایک ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا جس میں اسلام کے

علاوہ دوسرے باطل ادیان کا مدلل طریقے سے رد منظور تھا۔ "مولانا محمد حسین بٹالوی نے مرزا کے اس کام کے لیے لاہور کو تجویز کیا اور ساتھ ہی ممکن امداد کا یقین بھی دلایا"[59]۔

چنانچہ مرزا قادیانی نے علمی شہرت کے لیے لاہور کو منتخب کیا اور قادیان سے لاہور منتقل ہو کر مولانا محمد حسین بٹالوی کے پاس رہائش پذیر ہو گیا۔ پس مرزا قادیانی کتابوں کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ ان کی جو تصنیفات ۱۸۸۰ء کے بعد شائع ہوئیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مطالعے کا موضوع زیادہ تر مذاہب اور خاص طور پر مسیحیت، سناتن دھرم اور آریہ سماج کی کتابیں تھیں۔ یہ دور مذہبی مناظروں کا تھا۔ ایسے ماحول میں جو شخص اسلام کی مدافعت اور مذہب غیر کی تردید کا علم بلند کرتا وہ مسلمانوں کا مرکز توجہ و عقیدت بن جاتا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد نے براہین احمدیہ علی حقیقۃ لکتاب اللہ القرآن والنبوۃ المعدیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب نے مرزا کو بے حد شہرت دی۔ مرزا بشیر الدین محمود لکھتے ہیں کہ "براہین احمدی کی تصنیف سے پہلے حضرت مسیح موعود ایک گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے اور گوشہ نشینی میں درویشانہ حالت تھی"[60]۔

مرزا غلام احمد خود بھی براہین احمدیہ کی تصنیف سے اپنی حالت کو کچھ یوں بیان کرتا ہے:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا نہ کوئی موافق تھا اور نہ مخالف۔ کیونکہ اس زمانے میں میں کچھ بھی چیز نہ تھا اور ایک احد من الناس اور زاویہ گمنامی میں پوشیدہ تھا"[61]۔

براہین احمدیہ میں مرزا غلام احمد نے انگریز کی مکمل اطاعت اور ان سے وفاداری پر زور دیا اور وہ لوگ جو ان کے خلاف باغیانہ خیالات رکھتے تھے اور ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر جہاد کی فرضیت کے قائل تھے، انہیں نہایت سخت الفاظ میں خطاب کیا اور ساتھ یہ اعلان کیا کہ جہاد کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ بہر حال کتاب براہین احمدیہ ہزارہا خامیوں کے باوجود اس لحاظ سے تاریخ قادیانیت میں اہم مقام رکھتی ہے کہ اس سے مرزا غلام احمد قادیانی اپنی زندگی کے دور ثانی میں داخل ہوئے۔ جہاں انہوں نے یکے بعد دیگرے مجدد، مثیل مسیح، مسیح موعود، نبی اور رسول کا دعویٰ کر کے ملتِ اسلامیہ کو خلفشار، نفاق اور

---

59 خالد بشیر احمد، تاریخ محاسبہ قادیانیت، نفیس پرنٹنگ پریس فیصل آباد، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۳۴۔

60 سیرت المہدی، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

61 مرزا غلام احمد قادیانی، تتمہ حقیقۃ الوحی، قادیان، ۱۹۲۳ء، ص ۶۷-۶۸۔

اختلافات کی دلدل میں دھکیل دیا اور اس طرح قیامت تک مسلمانوں کی نگاہوں میں ایک ایسے فرد کی شکل اختیار کرلی جس کے لیے معمولی ایمان کا آدمی بھی اپنے دل میں اچھا خیال نہیں لا سکتا۔

مامور من اللہ ۱۸۸۰

مرزا قادیانی نے اپنی کتاب براہین احمدیہ کے ساتھ ایک اشتہار میں بتایا کہ وہ خدا کی طرف سے مامور ہوا ہے اور اس کے لیے تمام مذاہب کو مطمئن کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس اشتہار میں صاف صاف کہا گیا کہ "یہ عاجز (مؤلف براہین احمدیہ) حضرت قادرِ مطلق جل شانہ کی طرف سے مامور ہوا ہے کہ نبی ناصری اسرائیلی (مسیح) کے طرز پر کمال مسکینی و فروتنی و غربت و تذلّل و تواضع سے اصلاح خلق کے لیے کوشش کرے اور ان لوگوں کو جو راہ راست سے بے خبر ہیں صراط مستقیم (جس پر چلنے سے حقیقی نجات حاصل ہوتی ہے اور اس عالم میں بہشتی زندگی کے آثار اور قبولیت اور محبوبیت کے انوار دکھائی دیتے ہیں) دکھادے"[62]۔

اس اعلان سے مرزا نے دعویٰ نبوت کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھایا اور پہلے مناظر، مصنف اور اب مامور من اللہ بن بیٹھا۔ اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا ذہن اس میدان میں خوب کام کررہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ لوگوں کو اپنے ساتھ مانوس کرکے بالآخر انہیں گمراہی کے گڑھے میں دھکیلنا شروع کیا۔ براہین احمدیہ کا مرکزی مفہوم چونکہ یہ تھا کہ الہامات مرزا کو ہوتے رہتے ہیں اورا نہی الہامات کی بنیاد پر انھوں نے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ مرزا غلام احمد نے کہا کہ "براہین کے وقت مؤلف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملہم اور مامور تھا"[63]۔

دعویٰ مجددیت ۱۸۸۹ء

۱۸۸۹ء میں جب مرزا قادیانی لدھیانہ گیا تو قیام کے دوران ہی اپنے مجدد ہونے کا اعلان کر دیا اور یہ اعلان بھی انتہائی منظم طور پر کیا۔ بیرونی دنیا سے مختلف غیر مسلم معروف شخصیتوں کے پتے منگوائے، یورپ، امریکہ، افریقہ کے تمام وزراء اور عمال حکومت، دنیا کے مدبروں، مصنفوں، ہندوستان کے سبھی راجے اور نوابوں کے نام اس فہرست میں شامل تھے۔ جنھیں مرزا نے اردو میں شائع شدہ

---

62 سیرت المھدی، ص ۴۵۔
63 میر قسیم علی قادیانی، تبلیغ رسالت، قادیان، ن۔د، جلد اوّل، ص ۶۱۔

دعوت ناموں کے ذریعے اپنے مجدد ہونے کی اطلاع دے کر انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ بیس ہزار دعوت ناموں کی ترسیل کا اہتمام کیا گیا۔

مرزا غلام احمد کا صاحبزادہ بشیر احمد لکھتا ہے کہ "دنیا کا کوئی ایسا مشہور و معروف آدمی نہ تھا جو کسی قسم کی کوئی دینی دنیاوی اہمیت رکھتا ہو اور اسے اشتہار نہ بھجوایا گیا ہو"[64]۔ اس کے ساتھ ہی مرزا نے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کر دیا اور سادہ لوح انسان مرزا قادیانی سے بیعت ہوئے۔ تاہم علمائے لدھیانہ نے مرزا قادیانی کی شدید مخالفت کا آغاز کر دیا۔

مرزا غلام احمد نے جب بیعت لینی شروع کی تو انگریز حکومت کی اطاعت و فرمانبرداری کو بیعت کی بنیادی شرط قرار دیا۔ میاں محمود احمد قادیانی (قادیانیوں کے دوسرے خلیفہ) نے تحریر کیا کہ "آپ (یعنی مرزا غلام احمد) نے اپنی تقریباً کل کتب میں اپنی جماعت کو نصیحت کی ہے کہ وہ جس گورنمنٹ کے ماتحت رہیں اس کی پوری طور پر فرمانبرداری کریں"[65]۔

بیعت کے وقت یہ شرط عائد کرنا کہ حکومت سے وفادار رہنا ہو گا، یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مرزا غلام احمد انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ بہر حال مرزا نے مجدد ہونے کا دعویٰ کر کے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کی جانب ایک اور قدم آگے بڑھایا تاکہ جلدی جلدی مثیل مسیح اور مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر سکیں۔

مرزا قادیانی بطور محدث

مرزا قادیانی نے پہلے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ جب یہ دعویٰ کر لیا تو کچھ مدت گزرنے کے بعد پھر اس نے مجدد و محدث ہونے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ "ہمارے سیّد و رسول ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور بعد آنحضرت ﷺ کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اس لیے شریعت میں نبی قائم مقام محدث رکھے گئے ہیں"[66]۔

مرزا غلام احمد نے ایک اور جگہ یوں لکھا کہ:

---

64 سیرت المہدی، ص۱۴۔

65 سیرت المہدی، ص۱۴۔

66 غلام احمد قادیانی، شہادت القرآن، الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ، ن۔د، ص۲۸۔

"یہ عاجز خدا کی طرف سے امن کے لیے محدث ہو کر آیا ہے اور محدث بھی ایک معنی سے نبی ہی ہوتا ہے گو اس کے لیے نبوت تمام نہیں مگر تاہم جزوی طور پر ایک نبی ہی ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا ایک شرف رکھتا ہے اور امور غیبیہ اس سے ظاہر کیے جاتے ہیں"[67]۔

مندرجہ بالا تحریر کو آپ محدث ہونے کے دعویٰ پر منطبق کر لیں یا اسے دعویٰ نبوت سمجھ لیں یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ مرزا نے کمال ہمت سے اس میں اتنی گنجائش چھوڑی ہے کہ یہ تحریر دعویٰ بیک وقت محدث و نبوت کے وعدے کی تجویز ہے۔ مرزا غلام احمد کی تحریروں کی یہ صفت ہے کہ انہیں موقع و محل کے مطابق استعمال میں لا کر سیدھے سادے مسلمانوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مرزا قادیانی بطور مثیل مسیح

نزول مسیح کا عقیدہ ایک اسلامی عقیدہ ہے۔ مسلمان اس عقیدے سے واقف ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ احادیث میں بھی اس کی اطلاع دی گئی ہے۔ دوسری طرف مسلمان جو کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اپنی سیاسی بالادستی کھو دینے کی وجہ سے سخت مایوسی کا شکار ہو چکے تھے، ان کی منتظر آنکھیں کسی ایسے مرد خدا کی طرف لگی تھیں جو انہیں اس ابتلا سے نجات دلائے۔

ایک اور اہم بات کہ تیرھویں صدی کے خاتمے پر ظہور مسیح کا چرچا بھی تھا۔ اسی بنا پر ہو سکتا ہے کہ مرزا کا یہ خیال ہو کہ اب تک دینی خدمات سے جو مقام انہوں نے حاصل کر لیا تھا اس کی بنا پر مسلمان ان کے دعویٰ مسیحیت کو تسلیم کر لیں گے۔ اس ضمن میں حکیم نور الدین (جو کہ مرزا کا دیرینہ دوست تھا اور اکثر مرزا اپنے خانگی و ازدواجی امور تک میں ان سے مشورہ لیتا تھا) کے مشورے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جب حکیم نور الدین نے مرزا کو مسیح بننے کا مشورہ دیا تو مرزا نے جواباً لکھا" در حقیقت اس عاجز کو مثیل مسیح بننے کی کچھ حاجت نہیں۔ یہ چاہتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے عاجز اور مطیع بندوں میں داخل کر لیوے۔ لیکن ہم ابتلا سے کسی طرح بھاگ نہیں سکتے"[68]۔

اس خط میں مرزا نے حکیم جی کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر لی لیکن بعد میں اس تجویز

---

67 غلام احمد قادیانی، توضیح مرام، ریاض الہند پریس امرتسر، ۱۹۲۲ء، ص ۱۵۔

68 غلام احمد قادیانی، مکتوبات احمد، قادیان، ن۔ د، ص ۸۵۔

کو قبول بھی کر لیا اور کہا: "مجھے مسیح ابن مریم ہونے کا دعویٰ نہیں اور نہ میں تناسخ کا قائل ہوں بلکہ مجھے تو فقط مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ ہے۔ جس طرح محدثیت نبوت سے مشابہ ہے ایسے ہی میری روحانی حالت مسیح ابن مریم کی روحانی حالت سے مشابہت رکھتی ہے"[69]۔ مرزا نے اپنے آپ کو مثیل مسیح کہہ کر اس بات کی تردید کی ہے کہ وہ مسیح موعود نہیں۔ اُن کی رائے انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"اس عاجز نے جو مثیل موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس کو کم فہم لوگ مسیح موعود خیال کر بیٹھے ہیں یہ کوئی نیا دعویٰ نہیں جو آج ہی میرے منہ سے سنا گیا ہو بلکہ یہ وہی پرانا الہام ہے جو میں نے خدا تعالیٰ سے پا کہ براہین احمدیہ کے کئی مقامات پر بہ تصریح درج کر دیا تھا۔ جس کے شائع کرنے پر سات سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا ہو گا۔ میں نے دعویٰ ہر گز نہیں کیا کہ میں مسیح ابن مریم ہوں۔ جو شخص یہ الزام میرے پہ لگا دے، وہ سراسر مفتری اور کذاب ہے"[70]۔

مرزا غلام احمد کی مندرجہ بالا تحریر کے بعد حیرانی ہے کہ انہوں نے کمال ڈھٹائی کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔

مرزا غلام احمد کہتے ہیں:

"میرے دعویٰ مسیح موعود کی بنیاد انہی الہامات (براہین احمدیہ) سے پڑی۔ انہیں میں میرا نام خدا تعالیٰ نے عیسیٰ رکھا اور جو آیتیں 'مسیح موعود' کے حق میں تھیں وہ میرے حق میں بیان کر دیں۔ اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی اُن کو قبول نہ کرتے۔ یہ خدائی قدرت ہے کہ انہوں نے قبول کر لیا اور اس پیچ میں پھنس گئے"[71]۔

مندرجہ بالا اقتباس یہ واضح کر رہا ہے کہ مرزا اب اپنے آپ کو مسیح موعود کہہ رہے ہیں۔

مرزا بطور ظلی بروزی نبوت

مرزا نے مامور من اللہ، دعویٰ مجددئیت و محدث، مثیل مسیح اور پھر مسیح موعود اور آخر کار نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ یہاں بھی وہ کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے پہلے ظلی و بروزی نبوت کا دعویدار بنا۔

---

69 میر قاسم علی قادیانی، اشتہار مرزا غلام احمد، مدرج تبلیغ رسالت، جلد دوئم، ن۔د، ص ۲۱۔

70 غلام احمد قادیانی، ازالہ اوہام، مقام طبع ندارد، طبع دوئم، ن۔د، ص ۱۹۵۔

71 غلام احمد قادیانی، اربعین، ضیاء الاسلام قادیان، دسمبر ۱۹۰۰ء، ص ۲۱۔

اس سلسلے میں وہ کہتا ہے:

"میں بموجب آیت وآخرین منھم لمایلحقوا بھم بروزی طور پر وہی نبی خاتم الانبیاء ہوں اور خدا نے آج سے بیس برس پہلے براہین احمدیہ میں میرا نام محمد اور احمد رکھا اور مجھے آنحضرت کا ہی وجود قرار دیا۔ پس اس طرح آنحضرت کے خاتم الانبیاء ہونے میں میری نبوت سے کوئی تزلزل نہیں آتا کیونکہ ظل اپنے اصل سے علیحدہ نہیں ہوتا اور چونکہ میں ظلی طور پر محمد ہوں پس اس طور پر خاتم النبیین کی مہر نہیں ٹوٹی کیونکہ محمد کی مہر محمدیت ہی میں محدود رہی یعنی بہر حال محمد ہی نبی رہے نہ اور کوئی یعنی جبکہ میں بروزی طور پر آنحضرت ہوں اور بروزی رنگ میں تمام کمالات محمدی مع نبوت محمدیہ کے میرے آئینہ ظلمت میں منعکس ہیں تو پھر کونسا الگ انسان ہوا جس نے علیحدہ طور پر نبوت کا دعویٰ کیا"[72]۔

چنانچہ اس دعویٰ کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کچھ عرصہ تک خود کو ظلی و بروزی ظاہر کرتا رہا۔ مرزا قادیانی نے ۱۹۰۲ء میں ایک رسالہ تحفت الندوہ لکھا جس میں لکھا کہ "پس جیسا کہ میں نے بار بار بیان کر دیا ہے کہ یہ کلام جو میں سنتا ہوں یہ قطعی اور یقینی طور پر خدا کا کلام ہے جیسا کہ قرآن اور توریت خدا کا کلام ہے۔..... ہر ایک مسلمان کو دینی امور میں میری اطاعت واجب ہے اور ہر ایک جس کو میری تبلیغ پہنچ گئی ہے گو وہ مسلمان ہے مگر مجھے اپنا حکم نہیں ٹھہراتا اور نہ مجھے مسیح موعود مانتا ہے اور نہ میری وحی خدا کی طرف سے جانتا ہے، وہ آسمان پر قابل مواخذہ ہے[73]۔

محولہ بالا اقتباس اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ بالآخر مرزا نے مسلمانوں کو اخروی نجات سے محروم رہنے کا پیغام سنا دیا۔ ہاں اگر وہ مرزا کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو نجات ممکن ہے۔

مستقل نبوت کا دعویدار

عقیدہ ختم نبوت پر مسلمان دل سے ایمان رکھتے ہیں۔ اس عقیدے پر ایمان نہ رکھنے والا مسلمانوں میں سے نہیں۔ سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۹۹ء) نے عقیدہ ختم نبوت کو زندگی اور تمدن پر احسان کا نام دیا۔ اس حوالے سے آپ کا یہ اقتباس آب زر سے لکھنے کے لائق ہے:

72 غلام احمد قادیانی، ایک غلطی کا ازالہ، مقام طبع ندارد، ن۔د، ص ۱۰، ۱۱۔

73 غلام احمد قادیانی، تحفۃ الندوہ، ص ۴، بحوالہ قادیانیت مطالعہ وجائزہ، ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی، اشاعت پنجم، ۱۹۸۵ء، ص ۸۵، ۸۶۔

"عقیدہ ختم نبوت در حقیقت نوع انسانی کے لئے ایک شرف امتیاز ہے۔ وہ اس بات کا اعلان ہے کہ نوع انسانی سن بلوغ کو پہنچ گئی ہے اور اس میں یہ لیاقت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کو قبول کرے۔ اب انسانی معاشرے کو کسی نئے آسمانی پیغام کی ضرورت نہیں۔ اس عقیدے سے انسان کے اندر خود اعتمادی کی روح پیدا ہوتی ہے، اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اپنے نقطہ عروج کو پہنچ چکا ہے"[74]۔

اگر ختم نبوت کا عقیدہ نہ ہو تو انسان ہمیشہ اپنے مستقبل سے غیر مطمئن رہے گا۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد آخر کار مرزا غلام احمد قادیانی نے صاف طور پر اجزائے نبوت کو عقیدے کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے ختم نبوت کے بنیادی عقائد سے بغاوت کی اور اپنے سچے نبی ہونے کا اعلان کر دیا کہ

"میں اس خدا کی قسم کھاتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا اور اسی نے مجھے مسیح موعود کے نام سے پکارا ہے اور اس نے میری تصدیق کے لئے بڑے بڑے نشان ظاہر کئے جو تین لاکھ کو پہنچتے ہیں"[75]

ایک اور جگہ مرزا کہتا ہے کہ "میرے آنے سے اسلامی عمارت کی تکمیل ہوئی"[76]۔

پس مرزا قادیانی نے مختلف ادوار میں دعوے کر کے مسلمانوں کے درمیان مستقل طور پر اختلاف کا دروازہ کھول دیا اور آخر میں نبوت کا دعویٰ کر کے ایک الگ ملت کی داغ بیل ڈالی۔ اس میں شک نہیں کہ قادیانی، مسلمانوں میں سے نہیں۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء

۱۹۵۳ء کی تحریک راست اقدام مرزائیت کے خلاف سب سے بڑی تحریک تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ پاکستان اسلامی ریاست ہوتے ہوئے غیر اسلامی مذہب کو اس قدر اہمیت نہیں دے گا کہ وہ یعنی قادیانی براہ راست اس کے نظم و نسق پر حاوی ہو جائیں۔ مگر بدقسمتی سے کچھ عرصہ بعد ہی پاکستان مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی محلاتی سازشوں کا شکار ہونے لگا۔ خان لیاقت علی خان (م:

---

74 حوالہ سابق، ص ۱۶۳، ۱۶۴۔

75 غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، قادیان، بار دوئم ستمبر ۱۹۲۳ء، ص ۶۸۔

76 غلام احمد قادیانی، کشتی نوح، ضیاء الاسلام قادیان، ۱۹۰۴ء، ص ۱۳۔

۱۹۴۹ء) کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین (۱۸۴۹ء۔ ۱۹۶۴ء) وزارت عظمٰی کے عہدے پر فائز ہوئے اور ملک غلام محمد (۱۸۹۵ء۔ ۱۹۵۶) جو وزیر خزانہ تھے، انہیں پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بنادیا گیا۔ خواجہ صاحب کے دور میں پنجاب میں قادیانیت اور اسلام کے مابین بڑے بڑے معرکے ہوئے۔

پنجاب میں میاں ممتاز دولتانہ (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۹۶ء) اور سرحد میں خان عبدالقیوم خان (۱۹۰۱ء۔ ۱۹۸۱ء) نے سیاسی جوڑ توڑ کے لئے من مانی کاروائیاں شروع کر دیں۔ اس طرح سندھ میں وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۸۰ء) نے اپنی کرسی کو مضبوط کرنے کے لئے کئی سیاسی چالیں چلی ہوئی تھیں جن کے نتیجے میں گورنر شیخ دین محمد (۱۸۸۶ء۔ ۱۹۶۵ء) نے پروڈا کے تحت ایوب کھوڑو کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ قیام پاکستان سے ہی مشرقی پاکستان میں اُردو بنگالی زبان کا تنازعہ تھا جو کہ ۱۹۵۲ء۔ ۱۹۵۳ء تک عروج پر پہنچ چکا تھا۔ پورا ملک ہی انتظامی بد عملی کا شکار تھا۔ چنانچہ ایسے سیاسی حالات میں مرزائیوں نے اپنی مذہبی سرگرمیاں تیز کر دیں۔

خواجہ ناظم الدین کا دور اور قادیانیوں کے خلاف عوامی جدوجہد

خواجہ ناظم الدین کے دور میں قادیانیوں نے کھلے عام اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی شروع کی۔ اکثر جلسوں میں سرکاری ملازمین جو قادیانی تھے انہیں مہمان خصوصی بنایا جاتا جس میں وہ سرکاری پروٹوکول سے جاتے اور عام تاثر یہ آتا کہ جیسے حکومت اُن کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اس ضمن میں لائل پور (فیصل آباد) میں قادیانیوں نے سیرت کے نام پر بڑا جلسہ کیا جس کی منادی شہر میں کرائی گئی۔ ایسے میں مجلس احرار والے سخت غم و غصہ کے عالم میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ بھی وہیں جلسہ کریں گے۔ احرار والوں نے بھی منادی کرادی۔ منادی کا ہونا تھا کہ سینکڑوں مسلمان جمع ہونا شروع ہو گئے اور بوہڑ انوالہ گراونڈ کے کنارے پر ایک پنڈال بنایا گیا۔ اب ادھر قادیانیوں کا جلسہ شروع ہوا۔ قادیانی مقرر نے کوئی بات مسلمانوں کے جذبات کے خلاف کی کہ مرزا غلام نبی جانباز نے احتجاج کیا۔ جس پر قادیانیوں نے سٹیج کے نیچے دو تین سو لاٹھیاں چھپا رکھی تھیں وہ نکال لیں اور مسلمانوں پر برسانا شروع کر دیں۔ مسلمانوں نے بھی اپنا بچاؤ کیا اور قادیانیوں کی پٹائی کی۔ اب تقریباً دس ہزار مسلمانوں کا جم غفیر قادیانیوں کی اس اشتعال انگیزی کے خلاف احتجاج کر رہا تھا کہ اس موقع پر پولیس پہنچ گئی جس نے چند

افراد مسلمانوں اور قادیانیوں کے گرفتار کر لئے[77]۔

قادیانیوں کا تاریخی جلسہ

کراچی میں قادیانیوں کا تاریخی جلسہ جہانگیر پارک میں منعقد ہوا۔ بڑے پیمانے پر اس کی تیاریاں ہوئیں، جس میں چوہدری ظفر اللہ (۱۸۹۳ء۔۱۹۸۵ء) نے تقریر کرنا تھی۔ حتیٰ کہ اس جلسے کیلئے غیر ملکی سفارت خانوں میں دعوت نامے بھیجے گئے۔ حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آگئی۔ پولیس سے رضاکاروں کا کام لیا گیا۔ جلسے میں تقریر کا عنوان تھا "زندہ اسلام" یعنی مرزائیت زندہ اسلام۔ کراچی کی دیواروں پر جب اس جلسے کے قد آدم پوسٹر چسپاں ہوئے تو کراچی کے اسلامی حلقوں میں ہل چل مچ گئی۔ چوہدری ظفر اللہ پورے سرکاری اہتمام کے ساتھ جلسہ گاہ آیا۔ پولیس کی بھاری نفری جلسہ گاہ میں موجود تھی لیکن عوام کا ردعمل شدید ترین تھا۔ شاید اگر حکومتی سرپرستی نہ ہوتی تو عوام اتنے شدید ردعمل کا مظاہرہ نہ کرتی لیکن اب تو عوام کو یقین آگیا کہ حکومت ہی اسلام کو ملک سے ختم کرنا چاہتی ہے۔ ہوا یوں کہ مسلمانوں نے خواجہ ناظم الدین کو پچاسیوں تاریں بھیجیں کہ مرزائیت کے جلسے کی بدعت ہمارے شہر میں نہ پھیلائی جائے۔ بالآخر خواجہ صاحب نے ظفر اللہ خان کو بلایا اور سردار عبدالرب نشتر (۱۸۹۹ء۔۱۹۵۸ء) کی موجودگی میں ان سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ عوام کے اشتعال اور ناراضگی کے پیش نظر آپ جلسہ میں شرکت نہ کریں تاکہ حکومت کی پوزیشن خراب نہ ہو۔ لیکن چوہدری نے خواجہ صاحب کو جواب دیا کہ میں وزارت سے استعفٰی دے سکتا ہوں لیکن جماعت کے جلسہ میں جانا منسوخ نہیں کر سکتا[78]۔

خواجہ صاحب اپنی شرافت کی وجہ سے خاموش ہوگئے۔ اگر اسی دن ہی ظفر اللہ خان سے استعفی طلب کر لیا جاتا تو قادیانیت کا زور اسی روز ہی ٹوٹ جاتا لیکن ایسا نہ ہوا اور جلسہ میں چوہدری ظفر اللہ نے بھرپور شرکت کی۔

مرزا محمود کا اعلان

دوسری طرف ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء کو مرزا محمود نے اعلان کیا کہ درج ذیل علماء سے خون کا بدلہ

77 اللہ وسایا، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، عالمی تحفظ ختم نبوت ملتان، اشاعت اوّل ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۵۔
78 حوالہ سابق، ص ۱۱۰۔

لیا جائے گا۔

۱۔ عطاء اللہ شاہ بخاری ۲۔ عبد الحامد بدایونی

۳۔ ملا مفتی محمد شفیع ۴۔ ملا مودودی[79]۔

ان علماء کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے مرزائیت کا عمیق مطالعہ کیا اور رد قادیانیت سے متعلق مشترک عمل کرنے کیلئے ہم آواز ہوگئے۔

جلسہ میں عوامی رد عمل اور اس کے بعد نتائج

چوہدری ظفر اللہ نے جلسہ میں کہا:

"احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے۔ اب وہ جڑ پکڑ گیا ہے۔ اگر یہ پودا اکھاڑ دیا گیا تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا۔ بلکہ ایک سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جائے گا اور دوسرے مذہب پر اپنی برتری کا ثبوت مہیا نہ کر سکے گا"[80] دوسری طرف فضا ختم نبوت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ ادھر پولیس حکم کی منتظر تھی، لاٹھی چلی، پکڑ دھکڑ ہوئی اور جلسہ ناکام ہو گیا۔ دوسرے دن صبح کو جلسے کی روئیداد ملک بھر میں پھیل گئی۔ جب یہ خبر لاہور پہنچی تو سخت ہلچل مچی۔ مجلس احرار نے جلسہ عام کا اعلان کیا اور احرار کی جانب سے بیرون دہلی دروازہ میں عظیم الشان جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں احتجاج کیا گیا: یا تو ظفر اللہ خان سے وزارت خارجہ کا قلمدان چھین لیجئے اور یا اسے منع کر دیا جائے کہ وہ زندہ اسلام اور مردہ اسلام کا وعظ کہنا چھوڑ دے۔[81]

ملک بھر میں جلسے جلوس منعقد ہوئے۔ ایسا ہی ایک جلوس ملتان میں بھی ہوا۔

ملتان جلوس پر فائرنگ

انہیں دنوں ملتان شہر کے تھانہ (کپ) کے سب انسپکٹر غلام مصطفی نے (جو کہ مرزائی تھا) جولائی ۱۹۵۲ء کو عوام کے ایک جلسے پر لاٹھی چارج کیا۔ عوام نے تھانہ کے سامنے جمع ہو کر اس کے خلاف احتجاج کیا تو اس مجمع پر بلا وارننگ گولی چلا دی گئی۔ دس منٹ تک ستر راونڈ چلائے گئے جس کے نتیجے

---

79 شورش کاشمیری، تحریک ختم نبوت، مطبوعہ چٹان لاہور، اشاعت دوئم ۱۹۸۰ء، ص۸۹۔

80 حوالہ سابق، ص۹۰۔

81 اللہ وسایا، تحریک ختم نبوت، ص۱۱۱۔

میں چھ مسلمان شہید ہوگئے اور زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اس خونی واردات کے خلاف سارے پاکستان میں یوم احتجاج منایا گیا[82]۔

ملتان کے چھ مسلمانوں کی شہادت نے ایک کہرام مچادیا۔ مسلمانوں نے پولیس فائرنگ پر شہر میں مکمل ہڑتال کرکے غم وغصے کا اظہار کیا۔

۲جون ۱۹۵۲ء کراچی کنونشن (مجلس مشاورت)

مولانا لال حسین اختر نے کراچی میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کی ایک میٹنگ بلائی جن کے سامنے صورتحال رکھی گئی اور ۳جون ۱۹۵۲ء کو ایک مجلس مشاورت طلب کی گئی۔

اس کانفرنس کے دعوت نامے پر مولانا احتشام الحق تھانوی (دیوبند)(۱۹۱۵ء۔ ۱۹۸۰ء)، مولانا عبد الحامد بدایونی (بریلوی)(۱۸۸۹ء۔ ۱۹۷۰ء)، مولانا مفتی جعفر حسین (شیعہ)، مولانا محمد یوسف (اہل حدیث) اور مولانا لال حسین اختر نے دستخط کیے۔ اس کانفرنس میں پہلی مرتبہ مندرجہ ذیل تین مطالبات بھی متعین کیے گئے:

۱۔ قادیانی ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں۔
۲۔ چوہدری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ کے عہدہ سے الگ کر دیا جائے۔
۳۔ تمام کلیدی اسامیوں سے قادیانی افسروں کو علیحدہ کر دیا جائے[83]۔

آل مسلم پارٹیز کنونشن

مجلس مشاورت ہی کے اجلاس میں آل مسلم پارٹیز کنونشن بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک بورڈ مقرر کیا گیا۔ اس بورڈ کا اجلاس ۱۳جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوا جس میں مندرجہ ذیل جماعتوں کو دعوت نامے جاری کیے گئے۔

۱۔ جمعیت العلمائے پاکستان ۲۔ جمعیت العلمائے اسلام
۳۔ جماعت اسلامی ۴۔ تنظیم اہلسنت والجماعت
۵۔ جمعیت اہلسنت ۶۔ جمعیت اہلحدیث

[82] جانباز مرزا، حیات امیر شریعت، لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۶۹ء، ص ۴۳۰۔
[83] اللہ وسایا، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ص ۱۱۴۔

۷۔ موتمر اہل حدیث پنجاب ۸۔ ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پنجاب

۹۔ مجلس تحفظ ختم نبوت ۱۰۔ مجلس احرار اسلام

۱۱۔ جمعیۃ العربیہ ۱۲۔ جمعیۃ الفلاح)[84]

مجلس عمل کا قیام

۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو برکت علی ہال لاہور میں آل مسلم پارٹیز کا ایک اور اجلاس ہوا جس کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ اگر حکومت نے ان کے مطالبات منظور نہ کئے تو وہ راست اقدام کریں گے۔ دوسری طرف کراچی میں ۱۳ جولائی کو ہی اس امر کا فیصلہ ہوا کہ مسئلہ قادیانیت پر آخری غور وخوض کرنے کے لئے ۱۶، ۱۷، ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں تمام مکاتب فکر کا کنونشن منعقد کیا جائے۔ اس ابتدائی اجتماع میں شرکت کیلئے مولانا ابو لحسنات قادری (۱۸۹۶ء۔ ۱۹۶۱ء)، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا مرتضی میکش لاہور سے کراچی گئے اور کنونشن کی تیاریوں کیلئے خدمات پیش کیں[85]۔

یہ کوئی معمولی اقدامات نہ تھے بلکہ مرزائیت کے شدید احتساب کی طرف فیصلہ کن اقدامات تھے۔ چونکہ یہ سب کچھ احرار رہنماؤں کی مساعی سے ہو رہا تھا اس لئے شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور سید عنایت شاہ بخاری وغیرہ گرفتار کیے گئے۔ اس کے بعد پنجاب کے مشہور شہروں جن میں سیالکوٹ، گوجرانوالہ، راولپنڈی، شیخوپورہ، میں مجلس عمل کے زیر اہتمام عظیم الشان کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں تاریخی اجتماعات ہوئے، مطالبات کو دہرایا گیا۔ عوام کو پرامن جدوجہد کی تلقین کی گئی اور حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات منظور کرے۔

مجلس عمل کے وفد کی ۱۳ اگست ۱۹۵۲ء کو وزیر اعظم سے ملاقات:

عوام کے اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے مجلس عمل نے فیصلہ کیا کہ اُن کا ایک وفد وزیر اعظم سے ملے۔ چنانچہ ۱۳ اگست ۱۹۵۲ء کو یہ وفد وزیر اعظم سے کراچی میں ملا لیکن انہوں نے وفد کو ٹرخا دیا اور کہا کہ ”کل ۱۴ اگست یوم پاکستان ہے۔ بعض مصروفیتوں میں الجھا ہوا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ

84 شورش کاشمیری، تحریک ختم نبوت، ص ۹۱۔

85 حوالہ سابق، ص ۹۱۔

یوم پاکستان کے گزر جانے کے بعد آپ تشریف لائیں"[86]۔

۱۴ اگست ۱۹۵۲ء

جب ۱۴ اگست کا دن آیا تو جہانگیر پارک کراچی میں ایک عظیم الشان اجتماع سے خواجہ صاحب نے خطاب کیا۔ مسلمانان کراچی بے پناہ جوش عقیدت اور جذبہ اسلامی کے تحت جہانگیر پارک میں جمع ہوئے کہ آج وزیر اعظم مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق اپنی پالیسی واضح کریں گے۔ لیکن وزیر اعظم کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کہ "جلسے اور مظاہرے اس بات کو ظاہر نہیں کرتے ہیں کہ ان مطالبات کے ساتھ عوام کی اکثریت بھی شامل ہے"[87]۔

وزیر اعظم کے رویہ پر عوامی رد عمل

مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ کراچی کے مسلمانوں نے اسی شب آرام باغ کراچی میں ایک عظیم الشان اجتماعی جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت احتشام الحق تھانوی نے سر انجام دی۔ یہ اجتماع اپنی نوعیت کا ایک تاریخی جلسہ تھا۔ اس جلسے میں خواجہ صاحب کے رویے کی پر زور مذمت کی گئی اور زبردست احتجاج کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے اور سر ظفر اللہ خاں کو وزارت خارجہ سے جلد از جلد الگ کر دے اور یہ کہ جب تک مسلمانوں کے خالص دینی مطالبات منظور نہیں کئے جاتے اس وقت تک وہ اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے[88]۔

وفد کی آخری ملاقات اور الٹی میٹم

۲۲ جنوری ۱۹۵۳ء کو پیر صاحب سرسینہ شریف کی زیر قیادت خواجہ صاحب سے وفد نے ملاقات کی۔ وفد نے خواجہ صاحب کو اپنی پچھلی ملاقاتوں کے بارے میں بھی بتایا اور کہا کہ اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تھے اور بے بس تھے تو ہمیں پہلی بار ہی کہہ دیتے ہم آپ کو بار بار زحمت نہ دیتے۔ اس کے بعد اپنے مطالبات دہرائے اور قادیانیت پر بحث بھی کی اور آخر میں پیر صاحب سرسینہ شریف نے خواجہ صاحب کو تیس دن کا الٹی میٹم دیا۔ وہ فرمانے لگے الٹی میٹم کیسا؟ تو پیر صاحب نے فرمایا کہ یہ فیصلہ تو آل

---

86 اللہ وسایا، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، ۲۰۸، ۲۰۹۔

87 حوالہ سابق، ص ۲۰۹۔

88 حوالہ سابق، ص ۲۱۰۔

مسلم کنونشن کا فیصلہ ہے۔ مسلمانوں کی جانب سے آپ کو یہ مطالبات مان لینا چاہئیں[89]۔

خواجہ صاحب نے کہا کہ "میں اگر قادیانیوں کے خلاف آپ کا مطالبہ مان لوں تو امریکہ ہمیں ایک دانہ گندم کا نہیں دے گا۔ دوسرا یہ کہ وہ کشمیر کے مسئلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرے گا"[90]۔

خواجہ ناظم الدین کے الفاظ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ امریکہ قادیانیت کی مکمل حمایت کر رہا تھا کیونکہ مرزا غلام احمد مسلمانوں کی کمر میں چھرا گھونپ رہا تھا اور جہاد کے خلاف فتویٰ بھی مرزا غلام احمد ہی نے دیا تھا۔ غیر مسلم طاقتیں ہمیشہ مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے خائف رہی ہیں۔ دوسری چیز مسلمانوں کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت ہے جس سے یہود و ہنود خائف ہیں۔ مرزا غلام احمد نے اس محبت پر بھی وار کیا اور اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا جس سے وہ امریکہ کا چہیتا بن گیا۔

عوام میں شدید غم وغصہ

اب عوام کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک ماہ کا عرصہ گزر جائے گا لیکن خواجہ صاحب یہ مطالبات تسلیم نہیں کریں گے۔ اس لئے عوام مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ "زمیندار" اخبار اس زمانے میں مغربی پاکستان کا عظیم اخبار تھا۔ اس اخبار میں روزانہ ایک چوکھٹا شائع ہوتا تھا جس کی عبارت ہوتی "مجلس عمل کے نوٹس کی میعاد میں صرف..... دن باقی، حکومت اور وزراء کے جذبہ ایمان کا امتحان"[91]۔

لاہور میں جلسہ عام

۵ فروری ۱۹۵۳ء کو بیرون باغ موچی دروازہ لاہور میں مولانا ابوالحسنات کے زیر صدارت عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں بے پناہ لوگ تھے۔ تاحد نظر عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود تھا۔ عوام کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ وہ مقرر کی زبان سے نرم بات سن کر ناک بھوئیں چڑھاتے تھے۔ مولانا عبد الغفور ہزاروی (۱۹۱۰ء۔۱۹۷۰ء) نے قوم سے پر جوش خطاب کیا۔ آپ نے دوران تقریر کہا:

"خواجہ صاحب یا ممتاز دولتانہ کا نام طاقت نہیں۔ طاقت عوام کا نام ہے اور عوام کی طاقت کے سامنے حکومت کو جھکنا ہی پڑے گا۔ اگر تحفظ ختم نبوت کے لئے عامۃ المسلمین نے اپنی اس جمہوری طاقت

89 حوالہ سابق، ص ۲۴۹۔

90 حوالہ سابق، ص ۲۴۹۔

91 حوالہ سابق، ص ۲۵۰۔

کا مظاہرہ نہ کیا تو وہ قیامت کے روز محمد عربی ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے"[92]۔

اس جلسے کے بعد رضا کارانِ ختم نبوت کی بھرتی کا کام شروع ہوا، ہر ضلع میں رضا کاروں کی بھرتی کا کام شروع ہوا۔ رضا کار اپنے بھرتی کے مراکز پر آتے جسم پر بڑی دلیری سے زخم لگاتے اور خون سے حلف نامے پر دستخط ثبت کر دیتے۔ بس ایسے معلوم ہوتا جیسے ان نوجوانوں کے سینوں میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے دل دھڑکنے لگے ہیں اور یہ دنیا و مافیہا سے منہ موڑ کر آپ ﷺ کی حرمت پر قربان ہو جانا چاہتے ہیں۔

الٹی میٹم کی مدت کا خاتمہ

۲۱ فروری ۱۹۵۳ئ؁ کو علمائے کرام کا ایک وفد جو مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۵۳ء)، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا مفتی محمد شفیع (۱۸۹۶ء۔ ۱۹۷۶ء)، مولانا عبد الحامد بدایونی اور پنجاب مجلس عمل کے رکن مولانا اختر علی خان پر مشتمل تھا، خواجہ ناظم الدین سے ملا اور اُن کو یاد دلایا گیا کہ ایک ماہ ختم ہو گیا ہے، آپ مطالبات کے لئے دوٹوک فیصلہ کریں لیکن خواجہ صاحب نے وہی پرانی باتیں دہرائیں اور معذرت کر لی۔ اسی وقت مجلس عمل نے ۲۴، ۲۵ اور ۲۶ فروری کو عظیم الشان جلسے منعقد کرنے کے فیصلے کئے۔ ان جلسوں میں امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۶۱ء) مولانا ابوالحسنات، مولانا احتشام الحق، صاحبزادہ سید فیض الحسن (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۸۴ء)، سید مظفر علی شمسی، مولانا لال حسین اختر، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا بدایونی اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے کراچی کے مسلمانوں کو خطاب کیا۔ آخری جلسہ نہایت ہی شاندار تھا۔

تحریک راست اقدام

خواجہ صاحب سے مایوس ہونے کے بعد مجلس عمل نے تحریک راست اقدام کا فیصلہ کیا اور یہ طے کیا کہ پانچ رضا کار ایسے جھنڈے اُٹھائے ہوئے ہوں گے جن پر مطالبات ثبت ہوں گے۔ شاہراہ عام سے نہیں بلکہ چھوٹی سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے وزیر اعظیم کی کوٹھی پر جائیں گے۔ اگر وہاں اِن رضا کاروں کو کوئی روکے گا تو وہ اس سے کہیں گے کہ وہ وزیر اعظم کی خدمت میں مطالبات پیش کرنے آئے ہیں اور وہ اسی صورت میں واپس جائیں گے کہ وزیر اعظم ان مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔

---

92 حوالہ سابق، ص ۲۶۱۔

اگر یہ رضاکار گرفتار کر لئے جائیں گے تو مجلس عمل پانچ رضاکاروں کا ایک اور دستہ بھیج دے گی اور یہ سلسلہ پر امن طریقے پر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مطالبات تسلیم نہ کئے جائیں۔[93] ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کی صبح مجلس عمل کے راہنماؤں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ یہ واقعہ صبح تقریباً چار بجے کا ہے۔ جن افراد کی گرفتاریاں ہوئیں ان میں امیر شریعت عطاء اللہ شاہ، مولانا ابوالحسنات، ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا لال حسین اختر، سید مظفر علی شمسی اور مولانا عبد الرحیم جوہر قابل ذکر ہیں۔[94] لیکن اخبارات وغیرہ میں یہ خبر نہ آسکی۔ اگلے دن ۲۸ فروری کو جب پنجاب کے مختلف شہروں میں گرفتاریاں ہوئیں تو لوگوں کو پتہ چلا کہ اب تحریک شروع ہو گئی ہے۔

عوام کا ردّ عمل

عوام نے تقریباً تمام شہروں میں ہڑتالیں کر دیں۔ تحریک ختم نبوت اور مرزائیت کا مسئلہ ہر شخص کا موضوع سخن بن گیا۔ لوگوں کو انتہائی صدمہ ہوا کہ حکومت نے مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بغیر کسی اعلان کے باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم جمع ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک جلسہ میں مولانا احمد علی لاہوری (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۶۲ء) پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود شرکت کے لئے آئے۔ لیکن پولیس نے مولانا احمد علی کو گرفتار کر لیا۔ لاہور کے عوام تحریک ختم نبوت کے رضاکاروں پر ہونے والے مظالم کو دیکھ کر ضبط اور صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور سول نافرمانی کی تحریک بغاوت میں تبدیل ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ تین دن تک پولیس نے بے پناہ مظالم ڈھائے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دس ہزار مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ ملک فیروز خان نون (۱۸۹۳ء۔ ۱۹۷۰ء) نے پبلک طور پر بیان دے کر اسی بات کی تصدیق اور تائید کی[95]۔

مارشل لاء ۱۹۵۳ء

جب پنجاب پولیس اپنے شدید ظلم و ستم کے باوجود تحریک پر کنٹرول نہ کر سکی بلکہ تحریک میں بغاوت ہونی شروع ہوئی تو ایسے میں صوبائی حکومت نے لاہور کو فوج کے حوالے کر دیا لیکن غیور مسلمان

---

93 جانباز مرزا، حیات امیر شریعت، ص ۴۴۲، ۴۴۳۔

94 حوالہ سابق، ص ۴۴۸۔

95 منیر انکوائری رپورٹ، ۵ مارچ کے حالات و واقعات، بحوالہ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء، اللہ وسایا، ص ۲۷۔۳۔

سوائے رب کے کسی سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ مولانا بہاؤالحق قاسمی، مولانا خلیل احمد قادری اور مولانا عبد الستار نیازی (۱۹۱۵ء۔ ۲۰۰۱ء) مارشل لاء کے دوران بھی مسجد وزیر خان میں جرأت اور حوصلہ مندی سے صبح وشام تقریریں کرتے، ہزارہا مسلمان ہر وقت مسجد میں موجود ہوتے)[96]۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۳ء کو مولانا عبد الستار نیازی اور مولانا مودودی (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۷۹ء) کو گرفتار کر لیا گیا اور دونوں کو مسلمانوں میں جذبات شہادت پیدا کرنے کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی۔ گرفتار شدگان کی سماعت کے لئے فوجی عدالتیں قائم کی گئیں۔ ایک قومی فوج نے اپنی ہی قوم سے اس طرز کا سلوک کیا جو فاتح اقوام مفتوح اقوام سے جنگ کے بعد کرتی ہیں۔

مارشل لاء انتظامیہ کو چیف آف جنرل سٹاف جنرل احیاء الدین جو ایک پکا قادیانی تھا کی ذات سے بڑی حوصلہ افزائی ملی۔ وہ اس تحریک کو کچلنے کے لئے سخت تشدد کا استعمال کرنے کے حق میں تھا[97]۔

آخر جب حالات قابو میں آگئے تو مارشل لاء ختم کر دیا گیا۔ لیکن عوام کے دلوں میں اپنی ہی فوج کے خلاف ایک قلق پیدا ہو گیا۔ اس طرح تحریک تو وقتی طور پر دب گئی لیکن دوررس اثرات مرتب کر گئی۔

۱۹۵۳ء کی ناکامی کے اسباب واثرات

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء ایک واقعہ تھا جس کو منیر انکوائری رپورٹ میں "احمدی اور احراری" نزاع قرار دیا گیا اور جس کو حکومت نے جزوی مارشل لاء لگا کر وقتی طور پر دبا لیا لیکن اس تحریک نے بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ ذیل میں ہم ان اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ قادیانی مسلے کا عوام میں شعور پیدا ہوا۔ مسلمانوں کے تمام فرقے ایک مسئلے پر جمع ہوئے۔ اس وقت جتنی بھی مذہبی جماعتیں تھیں سب نے بھرپور حصہ لیا۔ شیعہ اور سنی فرقوں نے بیک آواز ہو کر حکومت سے مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

۲۔ پاکستان کی سیاسی مرکزیت اس سانحہ کے بعد کمزور ہونے لگی۔ اسی زمانے میں پاکستان کی

---

96 شورش کاشمیری، تحریک ختم نبوت، ص ۱۳۴۔

97 میجر جنرل (ریٹائرڈ) امراؤ خاں، ایک جرنیل کی سرگزشت، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۹۲۔

سیاسی ابتری شروع ہوئی اور حالات بگڑتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ عالمی طاقتوں نے پاکستان کو اپنی شطرنج کا مہرہ بنالیا۔ جمہوریت کمزور ہو گئی۔ ملک غلام محمد نے میاں ممتاز دولتانہ کو خواجہ ناظم الدین سے برخاست کروایا اور پھر ایک ماہ بعد خواجہ صاحب کو بھی برخاست کر دیا اور قومی اسمبلی توڑ دی۔

۳۔ تحریک کی پسپائی کے بعد مرزائیوں نے مختلف محکموں میں حصول اقتدار کا منصوبہ تیار کیا۔ قادیانی امت نے ملک غلام محمد کے زمانہ ہی سے فوج میں اپنی طاقت پیدا کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اسکندر مرزا کے عہد میں اس ارادے میں مضبوطی آئی۔ چوہدری ظفر اللہ کا پاکستان کی وزارت خارجہ سے سبکدوش ہو کر نیشنل کورٹ کا جج ہونا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

۴۔ تحریک کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ تحریک وقتی طور پر دب گئی لیکن لوگوں کے دلوں میں مرزائیوں کے خلاف نفرت موجود رہی۔ وہ موقع کی تلاش میں رہے اور ۱۹۷۴ء میں اُن کو جوں ہی موقع ملا انہوں نے دل کھول کر قادیانیوں کے خلاف تحریک میں حصہ لیا اور آخر پاکستان کی پارلیمنٹ نے ان کو ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو غیر مسلم قرار دے دیا۔ اس طرح ۱۹۵۳ء میں جو تحریک شروع ہوئی تھی ۱۹۷۴ء میں جا کر کامیاب ہوئی۔

۵۔ تحریک کی ناکامی کا اہم سبب حکومتی مظالم بھی تھے۔ پولیس نے ظلم و تشدد کی انتہا کر دی۔ سرعام جلسوں پر گولیاں چلائی جاتیں۔ ہزاروں لوگ گولیوں کا نشانہ بنے اور ظلم و ستم سے اس تحریک کو دبا دیا۔

۶۔ یہ تحریک گو کہ پورے ملک میں چلی تھی لیکن سوائے پنجاب اور سندھ کے دوسرے صوبوں میں زیادہ منظم نہیں تھی اور جب راست اقدام کے پہلے دن ہی مجلس عمل کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا تو پھر پیچھے کوئی اتنے بڑے لیڈر نہ تھے جو تحریک کو منظم رکھ سکتے۔ الغرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ناکام ہوئی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۷۴ء کی تحریک کی کامیابی میں اس تحریک کا اہم کردار ہے۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء

ختم نبوت کے سلسلے میں ۱۹۵۳ء کی تحریک راست اقدام حکومت کے وحشیانہ تشدد کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ جس نے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر حالات مستقلاً یونہی رہے تو نتیجے کے طور پر

ملت اسلامیہ کا وجود بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ مسلمانوں میں قادیانیت کے خلاف شعور بیدار کرنے کے لئے علماء کرام نے اہم کردار ادا کیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی شکل میں فتنے کی تردید کے لئے بے انتہا کوششیں کیں۔

تحریک راست اقدام ۱۹۵۳ء سے لے کر مارشل لاء ۱۹۵۸ء کے آغاز تک مرزائی اپنے سیاسی خاکوں میں رنگ بھرتے رہے۔

قادیانیوں کو فوجی آمریت ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر ملی۔ اس سے انہیں اپنے قدم جمانے کا موقع ملا اور انہوں نے بیرون ممالک اپنے تبلیغی مراکز قائم کئے۔ ایوبی دور حکومت میں قادیانی اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتے تھے۔ اس دور میں پاکستان اور بیرون ممالک انہوں نے بڑی تیزی سے ترقی کی[98]۔

۱۹۶۵ء میں محمد ایوب خاں (۱۹۰۷ء۔ ۱۹۷۴ء) نے انتخابات کروانے کا اعلان کیا، مارشل لاء ختم ہوا اور حزب اختلاف کی جماعتوں نے متحدہ حزب اختلاف کے نام سے ایک اتحاد محترمہ فاطمہ جناح (۱۸۹۳ء۔ ۱۹۶۷ء) کی قیادت میں بنایا مگر قادیانیوں نے کھلے عام ایوب خان کا ساتھ دیا۔ نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کونسل کی شہرت کو داغدار کرنے کے لئے ان کے قائدین کی کردار کشی کی گئی۔ اور قادیانیوں کی پشت پناہی سے فرضی تنظیموں نے سینکڑوں اشتہارات، رسالے، جرائد اور کتابچے شائع کروا کر تقسیم کیے۔ پس قادیانیوں نے ایوب خان کی انتخابی مہم میں ساتھ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان، ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں عوام کی توجہ ہندوستان کی طرف ہو گئی لیکن جب جنگ ختم ہوئی تو عوام کے جذبات پھر بھڑک اُٹھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر قادیانی ہی تعینات تھے جن کا حکومت میں اثر ورسوخ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ چنانچہ اسی کے خلاف عوام نے آواز اُٹھانی شروع کر دی لیکن قادیانی اس قدر اثر ورسوخ حاصل کر چکے تھے کہ انہوں نے عوامی رد عمل کو درخور اعتنانہ سمجھا۔ بہت سے علما کو گرفتار کر لیا گیا۔ مذہبی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں مثلاً مجلس احرار، جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی نے قادیانی سازشوں کو افشاء کرنے اور اس سامراجی سیاسی آلہ کار تنظیم کی درست انداز سے گت بنانے کے لئے بے

---

98 رپورٹ مجلس مشاورت، ربوہ ۲۲، ۲۴ مارچ ۱۹۶۳ء، ربوہ فیصلہ نمبر بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء، ص ۶۱۴۔

انتہا خدمات سر انجام دیں۔

۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء کو ہفت روزہ چٹان کے پریس کو ضبط کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ اس وقت تین اشخاص یعنی گورنر مغربی پاکستان جنرل موسیٰ خان، وزیر اطلاعات احمد سعید کرمانی اور ایوب خان کے سب سے زیادہ چہیتے الطاف گوہر کے عیارانہ اشتراک کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے پاکستان میں احمد یہ مخالف عناصر کو دبانے کے لئے ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا۔[99]۔ لیکن ان پابندیوں اور سختیوں کے باوجود ختم نبوت کے محافظ ان دھمکیوں سے مرعوب نہ ہونے۔ جمعیت علمائے اسلام کی لاہور میں کانفرنس کے دوران شورش کاشمیری نے ایک شاندار تقریر کی جس میں آپ نے چونکا دینے والے انکشافات کیے کہ

ا۔ ایوب خان اور اُس کے مشیر نوکر شاہی کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ ظالم آمرانہ حکومت نے عوام کو سیاسی و معاشی طور پر کچل کر رکھ دیا ہے۔

۲۔ قادیانیوں نے پاکستان میں بڑے اہم اور حساس عہدوں تک رسائی حاصل کرلی ہے۔ پروفیسر عبد السلام پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کا چیر مین (اور صدر کا مشیر برائے سائنس و ٹیکنالوجی) ہے۔ ایم ایم احمد منصوبہ بندی کمیشن کا ڈپٹی چیر مین ایم اختر پی آئی اے کا چیف ہے[100]۔

اس تقریر کے بعد شورش کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ شورش کی گرفتاری نے عوام میں ایک ہیجان برپا کر دیا۔ مشرقی و مغربی پاکستان میں عوام نے شورش کی رہائی کے لئے ایک بڑی تحریک چلائی۔ لہٰذا امن وامان کی صورتحال سے مجبور ہو کر حکومت نے ۲۵ دسمبر ۱۹۶۸ء کو شورش کو رہا کر دیا۔ حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ آرمی چیف جنرل آغا محمد یحییٰ خان (۱۹۱۷ء۔ ۱۹۸۰ء) نے ایوب خان کو مجبور کیا کہ وہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو اقتدار اس کے حوالے کر دے۔ آخر ایوب خان کو اس کے سوا کوئی حل نظر نہ آیا اور اقتدار کی کرسی پر جنرل یحییٰ خاں جلوہ افروز ہوا۔

یحییٰ خان کے دور حکومت میں بھی قادیانی برسر اقتدار رہے۔ ایم ایم احمد (ڈپٹی چیر مین منصوبہ بندی) صدر یحییٰ کا مشیر برائے اقتصادیات مقرر ہوا جو یحییٰ خان کے اندرونی کابینہ کے اہم رکن کے طور پر

---

99 بشیر احمد، تحریک احمدیت سامراجی گٹھ جوڑ، عبید اللہ اکیڈمی لاہور، ن۔ د، ص ۶۴۶۔

100 شورش کاشمیری، تحریک ختم نبوت، ص ۱۷۸۔

بھی کام کرتا رہا۔ اس ضمن میں کراچی کے جنگ اخبار نے لکھا کہ "بنگال سٹوڈنٹس لیگ کے صدر المجاہدی نے منصوبہ بندی کمیشن ڈپٹی چیرمین شپ سے ایم ایم احمد کی فوری برطرفی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ ایم ایم احمد نے ہمیشہ مشرقی پاکستان کو نظر انداز کیا ہے اور اپنی اقتصادی حکمت عملی سے مشرقی و مغربی اقتصادی عدم مساوات پیدا کی[101]۔

یحییٰ کے مارشل لاء کے بعد پاکستانی معاملات میں امریکی مداخلت خوفناک حد تک بڑھ گئی۔ اس میں بڑا ہاتھ ظفر اللہ قادیانی کا تھا جس نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ امریکہ اور صدر یحییٰ کے اہل کاروں کے درمیان رابطے کا کام جاری رکھا[102]۔ عوام کے پرزور مطالبے پر یحییٰ خان نے انتخابات کا اعلان کر دیا۔

چنانچہ پاکستان میں آئندہ ہونے والے انتخابات کے بارے میں پروگرام ترتیب دینے کے لئے لندن میں قادیانی اکابر سی آئی اے کے آلہ کار اور صیہونی تنظیموں کے ارکان کا ایک خفیہ اجلاس منعقد ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ احمدیہ جماعت کے ذریعے پاکستان میں سرگرم عمل اپنے آلہ کاروں کو سامراجی اور صیہونی تنظیمیں مالی اور اخلاقی امداد مہیا کریں گی[103]۔

انتخابات کے بعد بھٹو، مجیب تعلقات اچھے نہ تھے کہ مفاہمت کی راہ نکل سکتی۔ الغرض اندرونی و بیرونی ملکی حالات اتنے خراب ہوگئے کہ اس صورتحال میں ہندوستان نے بگڑتے ہوئے حالات سے فائدہ اُٹھایا، نتیجہ سقوط ڈھاکہ کی صورت میں نکلا اور ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھٹو نے بطور صدر پاکستان اقتدار سنبھالا۔ بھٹو حکومت کے ابتدائی دو سالوں میں قادیانیوں نے بھرپور تعاون کیا۔ الفضل ربوہ نے کئی اداریے لکھے جن میں لوگوں کو نصیحت کی گئی کہ وہ احتجاجی سیاست ترک کر دیں۔ امن و امان قائم کرنے میں حکومت کا ساتھ دیں اور عوامی حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں[104]۔

اپریل ۱۹۷۳ء میں قادیانیوں اور حکومت کے تعلقات میں اس وقت سرد مہری آئی جب حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے کے الزام میں تین قادیانی فوجی افسران (میجر فاروق آدم خاں،

---

101 جنگ کراچی، ۱۱ اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۶۔
102 بشیر احمد، تحریک احمدیت، سامراجی گٹھ جوڑ، ص ۶۵۵۔
103 حوالہ سابق، ص ۶۶۲، ۶۶۳۔
104 تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو الفضل ربوہ، ۱۹ دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۶۔

سکواڈرن لیڈر محمد غوث اور میجر سعید اختر ملک) کو گرفتار کر لیا گیا[105]۔

دو ماہ بعد حکومت نے ایک اور سازش کی اطلاع دی جس میں پاک فضائی افواج کے چودہ افسران ملوث تھے۔ ان افسران کے خلاف بڈبیر، اٹک میں دو جولائی ۱۹۷۳ء کو مقدمہ شروع کیا گیا۔ ایک ملزم گروپ کیپٹن عبد الستار نے یہ انکشاف کیا کہ احمدی بھٹو حکومت کو ختم کرنے کی سازشیں کر رہے ہیں۔ اس میں ائیر مارشل ظفر چوہدری اور ایئر وائس مارشل سعد اللہ خان، کور لیفٹیننٹ جنرل اے حمید خان اور ائیر کموڈور رائے ڈبلیو مفتی ملوث تھے[106]۔

چنانچہ ان تمام عزائم کے افشاء ہونے سے بھٹو پر سے احمدیت کا نقاب ہٹ گیا اور یہیں سے چپقلش کا آغاز ہوا۔ اسی دوران اپریل ۱۹۷۳ء میں بھٹو نے یہ راز افشاء کیا کہ اسرائیل نے پاکستان توڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے[107]۔

اسی دوران شورش کاشمیری نے بھٹو کو کھلا خط لکھا جس میں قادیانی اسرائیلی اتحاد کو اجاگر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ قادیانی پاکستان میں بالکل وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو صیہونی امریکہ اور برطانیہ میں ادا کر رہے ہیں[108]۔

شورش کاشمیری (م:۱۹۷۵ء) کے خط نے ذوالفقار علی بھٹو کی آنکھیں کھول دیں۔ پاکستان کے آئین میں قادیانی اپنے سیاسی، مذہبی اور معاشی مفادات کے تحفظ کے خواہشمند تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان سے بھی ملاقاتیں کیں۔ قادیانی جماعت کے خدشات دور کرنے کے لئے آئین کا حتمی مسودہ ظفر اللہ خان کو دکھایا گیا۔ اس نے آئین میں وزیر اعظم کو حاصل بے تحاشا اختیارات پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔[109]۔ لیکن حزب اختلاف کو تسلی دینے کے لئے آئین میں یہ ضروری قرار دیا گیا کہ صدر اور وزیر اعظم اس بات کا حلف اٹھائیں کہ وہ مسلمان ہیں اور حضرت محمد

---

105 بشیر احمد، تحریک احمدیت، سامراجی گٹھ جوڑ، ص ۶۹۵۔

106 پاکستان ٹائمز، ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء، بحوالہ تحریک احمدیت، سامراجی گٹھ جوڑ، ص ۶۹۶۔

107 حوالہ سابق، ص ۶۹۷۔

108 ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۱۹ اپریل ۱۹۷۳ء، ص ۳۔

109 پندرہ روزہ آتش فشاں، لاہور، ۷ مئی ۱۹۸۱ء، ص ۴۔

ﷺ کی ختم نبوت پر یقین رکھتے ہیں[110]۔

۲۹ اپریل ۱۹۷۳ء کو آزاد کشمیر اسمبلی کے رکن جناب (ریٹائرڈ) میجر محمد ایوب نے آزاد کشمیر اسمبلی کے ایوان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرار داد پیش کی جو بالا تفاق پاس ہو گئی[111]۔

اس قرار داد کا پاس ہونا تھا کہ پاکستان کے مسلمان عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کراچی سے خیبر تک اس قرار داد کا خیر مقدم کیا گیا۔ مرزائیت پر اوس پڑ گئی۔ اُن کی پریشانی قابل دید تھی۔ انہوں نے حکومت کا دروازہ ایک مرتبہ پھر کھٹکھٹایا اور بھٹو مرحوم کو ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں اپنی مدد و معاونت کا احسان یاد دلایا۔ بھٹو صاحب نے سردار عبد القیوم خاں پر پورا زور ڈالا کہ قرار داد واپس لے لی جائے مگر اب ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب پاکستان میں صورتحال سنگین ہو گئی کیونکہ عوام کا مطالبہ مزید بڑھ گیا کہ اب پاکستان کی حکومت بھی قادیانیوں کو اقلیت قرار دے۔ اسی دوران عوام کے جذبات اس وقت زیادہ بھڑک اٹھے جب مرزا ناصر احمد (۱۹۰۹ء۔ ۱۹۸۲ء) اپنے بیرونی رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے انگلستان اور افریقہ پہنچے۔ مرزا نے اپنے اس دورے کو کامیاب قرار دیا اور واپسی پر اس سفر کا کتابچہ شائع کیا گیا۔ اس کتابچہ میں نائجیریا کی ایک مسجد کے دروازہ پر کلمہ طیبہ 'محمد رسول اللہ' بدل کر "احمد رسول اللہ" کندہ کرایا گیا[112]۔ ہفت روزہ چٹان نے اس کی ایک فوٹو سٹیٹ شائع کر دی۔ اس کا چھپنا تھا کہ پورے ملک میں شور مچ گیا جس سے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور یہی وہ واقعہ تھا جس کی بنا پر آئین کے تحت قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔

سانحہ ربوہ

۲۲ مئی ۱۹۷۴ء کو نشتر میڈیکل کالج کے تقریباً سو طلباء شمالی علاقوں کی سیر و سیاحت کے لئے بذریعہ ایکسپریس ملتان سے پشاور روانہ ہوئے۔ ٹرین جب ربوہ (چناب نگر) ریلوے اسٹیشن پر رکی تو حسب معمول چند قادیانی نوجوان گاڑی کی مختلف بوگیوں میں داخل ہوئے اور قادیانیت کا لٹریچر تقسیم کرنا

---

110 بشیر احمد، تحریک احمدیت، سامراجی گٹھ جوڑ، ص ۶۹۸۔

111 تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء، حضوری باغ ملتان، اشاعت اوّل ۱۹۹۳ء، جلد اوّل، ص ۸۶۵۔

112 شورش کاشمیری، تحریک ختم نبوت، ص ۲۲۶۔

شروع کر دیا۔ جب طلباء کی بوگی میں کفر وارتداد کا یہ لڑیچر تقسیم کیا گیا تو طلباء میں اشتعال پھیل گیا۔ جواباً انہوں نے ربوہ ریلوے اسٹیشن پر ختم نبوت زندہ باد، قادیانیت مردہ باد کے زوردار نعرے لگائے۔ طلباء کی اس جرأت سے ربوہ کے قصر خلافت میں ایک زلزلہ آگیا۔ اور انہوں نے طلباء کو یادگار سبق سکھانے کا فیصلہ کیا[113]۔ چنانچہ ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں نے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء پر اس وقت حملہ کر دیا جب وہ تفریحی سفر سے واپس آرہے تھے۔ گاڑی جب ربوہ اسٹیشن پر رکی تو قادیانیوں نے حملہ کر دیا۔ اُن کے پاس ڈنڈے اور ہلکے ہتھیار تھے۔ پچاس طلباء کو بری طرح پیٹا گیا جن میں تیرہ کی حالت نازک تھی[114]۔ قادیانی حملہ آوروں نے طلباء کا قیمتی سامان اچک لیا، ان کے کپڑے پھاڑ دیئے۔ سگنل ہونے کے باوجود گاڑی کو چلنے نہ دیا۔ خدا خدا کر کے جب گاڑی چلی تو اس ظلم وبربریت کی خبر فیصل آباد پہنچ چکی تھی۔ غصّے سے بپھرا ہوا سارا شہر اسٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔ مجاہد ختم نبوت مولانا تاج محمود ان طلباء کے لئے چشم براہ تھے۔ ڈی سی، اے سی، ایس پی سمیت ساری انتظامیہ اسٹیشن پر موجود تھی۔ جونہی ٹرین اسٹیشن پر پہنچی، کہرام مچ گیا۔ لوگ جذبات میں آکر رو رہے تھے۔ مولانا تاج محمود نے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

”آپ کے بہنے والے ہر قطرہ سے قادیانیوں کی موت کے پروانے پر دستخط ہوں گے۔ اگر آپ کا خون رائیگاں گیا تو میں آپ کے خون کا جواب دوں گا“[115]۔

قادیانیوں کی اس دیدہ دلیری پر پوری قوم سراپا احتجاج بن گئی۔ عوام کے ملک گیر احتجاج کو دیکھتے ہوئے پنجاب گورنمنٹ نے سانحہ ربوہ کی عدالتی تحقیقات کا حکم دے دیا اور عدالت عالیہ کے جج مسٹر جسٹس کے اے صمدانی کو ربوہ کے واقع پر تحقیقات کے لئے مقرر کیا۔ برطانیہ میں مقیم احمدیوں نے یہ الزام لگایا کہ پاکستان میں احمدیوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن حکومت نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا۔ تحریک ختم نبوت کے عروج کے دنوں میں صوبہ سرحد کی اسمبلی نے پہل کرتے ہوئے جون ۱۹۷۴ء میں ایک قرارداد منظور کر لی جس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا[116]۔

113 اللہ وسایا، پارلیمنٹ میں قادیانی شکست، اشاعت اوّل ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۔
114 جسارت، کراچی، ۳۱ مئی ۱۹۷۴ء، ص ۲۔
115 اللہ وسایا، پارلیمنٹ میں قادیانی شکست، ص ۱۴۔
116 پاکستان ٹائمز، راولپنڈی، ۷ جون ۱۹۷۴ء، ص ۴۔

اس فیصلے کو وسیع پیمانے پر پذیرائی ملی۔ اب بھٹو حکومت مجبور ہو گئی کہ اس کا بہتر طریق کار اختیار کرے۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پون صدی پر پھیلی ہوئی جدوجہد تاریخ ساز لمحوں میں سمٹ آئی۔ مرکزی وزیر قانون جناب عبد الحفیظ پیرزادہ نے آئین میں ترمیم کا بل پیش کیا اس بل کو جب وزیر قانون پیش کر رہے تھے تو فقرے فقرے پر قومی اسمبلی کے ارکان جذبات سے بے قابو ہو کر ڈیسک اور تالیاں بجا رہے تھے۔ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی ترامیم کے حق میں ایک سو تیس ووٹ آئے جبکہ اس کی مخالفت میں ایک بھی ووٹ نہ ڈالا گیا[117]۔

قومی اسمبلی کے ساتھ سینٹ (Senate) نے بھی متفقہ طور پر اسے پاس کر لیا۔ جب بل متفقہ طور پر پاس ہو گیا تو حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے ارکان آپس میں فرط مسرت سے بغل گیر ہوئے حتیٰ کہ وزیر اعظم بھٹو اور عبد الولی خاں (۱۹۱۷ء۔ ۲۰۰۴ء) بھی گرمجوشی سے ملے[118]۔

اس بے نظیر فتح پر ملک میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ شہروں میں مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ مکانوں پر چراغاں کیے گئے۔ شہیدان نبوت کی قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں۔ مساجد میں خصوصی اجلاس ہوئے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس فیصلے کا کریڈٹ سب مسلمانوں کا حق ہے۔

حزب اقتدار، حزب اختلاف، علماء، طلباء سیاسی کارکن، صحافی الغرض سب نے اپنا فرض ادا کیا۔ مرزائیت کے خدوخال اجاگر کیے اور اس کی صحیح تصویر دیکھی بھی اور دکھائی بھی۔ اب یہی تصویر دستور کے صفحات پر ثبت رہے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے (انشاءاللہ وآمین)

---

117 شورش کاشمیری، تحریک ختم نبوت، ص ۲۵۱۔

118 حوالہ سابق، ص ۲۵۱۔

تیسرا باب: تبلیغی جماعت

تیسرا باب: تبلیغی جماعت

تعارف

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) کے بعد جب تحریک خلافت ناکام ہوئی اور جنگ کے وقت کیے گئے کھوکھلے وعدوں کی کلی کھل گئی تو بہت سے مسلمانوں نے سیاست سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ایسی تنظیموں کے قائم کرنے کا ارادہ کیا جو افراد اور معاشرے کی نشاۃ ثانیہ کیلئے کردار ادا کر سکیں۔ تبلیغی جماعت بھی ۱۹۲۷ء میں اسی مقصد کے تحت قائم کی گئی[119]۔

مولانا محمد الیاسؒ (۱۸۸۵ء۔۱۹۴۴ء) تبلیغی جماعت کے بانی ہیں۔ جماعت کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے ساتھی مسلمانوں کو دین کی بنیادی باتوں کی تعلیم دیں تاکہ معاشرے میں ایک دینی فضا پیدا ہو جائے۔

۱۹۴۴ء میں مولانا محمد الیاسؒ کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے مولانا محمد یوسف کاندھلوی (۱۹۱۷ء۔۱۹۶۵ء) کو تبلیغی جماعت کا امیر بنایا گیا۔ مولانا محمد یوسف کے انتقال کے بعد مولانا انعام الحسنؒ (م:۱۹۹۵ء) تیسرے امیر بنے۔

۱۹۹۵ء میں مولانا انعام الحسنؒ کے انتقال کے بعد نئے امیر کا انتخاب نہیں کیا گیا بلکہ ایک شوریٰ قائم کی گئی جس میں مولانا زبیر الحسن اور مولانا سعد کاندھلوی شامل ہیں[120]۔

۱۹۷۸ء میں ورلڈ مسلم لیگ نے ڈیوس بری انگلینڈ میں ایک عمارت تبلیغی جماعت کے لئے وقف کی جسے مسجد میں تبدیل کیا گیا اور اس وقت یہی مسجد یورپ میں تبلیغی جماعت کا ہیڈ کوارٹر ہے[121]۔

تبلیغی جماعت کا عالمی مرکز پاکستان میں لاہور کے قریب ایک جگہ پر واقع ہے جسے رائے ونڈ کہا جاتا ہے۔ جہاں ہر سال نومبر میں تبلیغی جماعت کا سالانہ عالمی اجتماع ہوتا ہے۔ اس اجتماع میں

---

[119] Anwar-ul-Haq, The faith movement of Moulana Muhammad Ilyas,London: Alten, 1972

[120] , Tablighi Jamaat-wikipedia, The free encyclopedia

.Alexiev, Alex. "Tablighi Jamaat: Jihad's stealthy Legions (http: //www.meforum.org/article/686)", Middle East Quarterly, winter 2005. Retrieved on 2007-02-01

[121] Ibid; p. 35

تقریباً ۲۰ لاکھ افراد شرکت کرتے ہیں[122]۔

انٹر نیشنل نیوز نیٹ ورک کی تحقیق کی مطابق حج کے بعد یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہو تا ہے۔

"The mammoth congregation of the faithful is said to be the largest after the Hajj pilgrimage in Makkah."[123]

تبلیغی جماعت کا یہ سالانہ اجتماع تین دن کے لئے منعقد ہو تا ہے۔ آخری دن اجتماعی دعا کے وقت رقت آمیز مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ لوگوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافے کی وجہ سے اب یہ اجتماع دو حصوں میں ہو تا ہے۔

اس سے پہلے کہ تبلیغی جماعت کے طریقہ تبلیغ، ذریعہ تبلیغ اور اثرات و نتائج کا تجزیہ کیا جائے، مناسب معلوم ہو تا ہے کہ بانی جماعت مولانا محمد الیاسؒ (۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء۔ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء) کا مختصر تعارف بیان کر دیا جائے۔

مولانا محمد الیاسؒ

مولانا محمد الیاسؒ کاندھلوی کی ولادت ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء اور وفات ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔

مولانا محمد الیاس خاندان ولی اللہی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہو گا کہ ہندوستان میں آل تیمور کی غلط سیاست نے دین اسلام کو جو نقصان پہنچایا تھا، اس کے تدارک اور اصلاح کا کام اللہ تعالیٰ نے اسی خاندان کے ذریعے لیا۔ مولانا محمد الیاسؒ نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں زندگی میں ہما ہمی پیدا کرنے کے لئے لوگوں کو فرضی واقعات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کئی کئی پشت سے اُن کے خاندان اور رشتہ داروں میں علماء اور مجاہدین کی شاندار روایا

---

[122] Raiwind-Wikipedia, the free encyclopedia

[123] http: //www.onlinenews.com.pk/articledetails.php id=37658

ت چلی آرہی تھیں۔ اُن کے گھر کے باہر اوراندر کی مجلسیں سید احمد شہیدؒ (۱۷۸۶ء۔ ۱۸۳۱ء) اور شاہ عبد العزیزؒ (۱۷۴۳ء۔ ۱۸۲۳ء) کے خاندان کے قصوں سے گرم تھیں۔

ان بزرگوں کے واقعات مردوں اور عورتوں کی زبانوں پر تھے اور گھر کی بیبیاں بچوں کو طوطا مینا اور پریوں کی کہانیاں سنانے کے بجائے اُن کے روح پرور واقعات سناتی تھیں۔ گھر میں ہر طرف نماز، روزہ، تلاوت اور ذکر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ گھر کی کوئی بڑی بی خوش ہوتیں تو یہ نہ کہتیں کہ "میرا بچہ آئی۔ سی۔ ایس میں جائے گا" بلکہ اُن کی زبان سے نکلتا "بیٹے مجھے تجھ سے صحابہ کی خوشبو آتی ہے۔" یہ تھے وہ ابتدائی خاندانی حالات جن میں مولانا محمد الیاسؒ کی پرورش ہوئی۔

آپ کے گھر میں ایک تجارتی کتب خانہ تھا جس کا انتظام آپ کے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب کرتے تھے۔ مولانا محمد الیاسؒ یوں بھی بچپن سے کمزور ہونے کی وجہ سے جسمانی مشقت کا کام نہ کر سکتے تھے اور وہ اس میں کچھ حصہ نہ لیتے تھے۔ اُن کا وقت زیادہ تر مطالعہ اور دینی مشاغل میں گزرتا تھا۔ اس کے برعکس بڑے بھائی کافی محنت سے کتاب خانہ کے امور انجام دیتے تھے۔ ایک روز کتاب خانہ کے منتظم نے کہا "مولوی الیاس کتاب خانہ کے کاموں میں کچھ ہاتھ نہیں بٹاتے۔ کوئی خدمت اُن کے ذمہ بھی کر دینی چاہیے۔" بڑے بھائی نے تکدّر کے ساتھ جواب دیا "میرا اعتقاد ہے کہ مجھے اسی بچہ کی برکت سے رزق مل رہا ہے۔ اس لئے آئندہ اس قسم کی بات مجھ سے نہ کہی جائے" اخلاص اور دینداری کے اس ماحول کا نتیجہ یہ تھا کہ مولانا کی پرورش اس طرح ہوئی گویا وہ دین کے گہوارے میں پل رہے ہیں۔ ایسے حالات میں جذبات کا دین کی راہ پر مڑ جانا بالکل فطری تھا۔ مولانا کے ایک ہم درس بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں جب وہ اُن کے ساتھ مکتب میں پڑھتے تھے، ایک دن آپ لکڑی لے آئے اور کہا "آؤ میاں ریاض الاسلام! چلو بے نمازیوں پر جہاد کریں"۔

مکتب کی تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا نے قدیم طرز پر عربی و دینی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم (سہارن پور) میں استاد مقرر ہوئے۔ مگر قدرت کو منظور تھا کہ اب آپ کو اگلے مرحلے کی تربیت گاہ میں پہنچایا جائے۔ آپ کے والد صاحب (مولانا محمد اسماعیلؒ م: ۱۳۱۵ھ /۱۸۹۸ء) دہلی کے پاس بستی نظام الدین میں رہتے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ جاری کیا تھا، جس میں کچھ غریبوں کے بچے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال

(۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء) کے بعد آپ کے بھائی مولانا محمدؒ (م: ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۹ء) نے اس مدرسہ کو سنبھالا۔ ۱۳۳۶ھ میں اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس وقت جب آپ اس سلسلہ میں نظام الدین گئے تو وہاں لوگوں نے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کریں اور والد اور بھائی کی جگہ، جو اُن کی وفات سے خالی ہوئی ہے، اس کو پُر کریں۔ آپ نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔ یہاں سے آپ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جب کہ میواتیوں سے تعلق کی وجہ سے آپ کو تبلیغی تحریک چلانے کی طرف توجہ ہوئی۔ تبلیغ کا ابتدائی محرک میواتی مسلمان بنے۔ اس کے بعد یہ کام دوسرے تمام مقامات پر پھیل گیا[124]۔

مولانا محمد الیاسؒ کا اخلاص

کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے قائدین اخلاص کا پیکر ہوں۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ تبلیغی جماعت کے قائدین (الا ماشاء اللہ) خلوص کے ساتھ اپنے کام میں مگن ہیں۔ اس تحریک کی فکری و عملی کمزوریوں پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ سر دست اس جماعت کے بانی مولانا محمد الیاسؒ کے خلوص اور اپنے مشن کے ساتھ سچی وابستگی کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

مولانا وحید الدین خاں اپنی کتاب تبلیغی تحریک میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران تبلیغ آپ (یعنی مولانا محمد الیاسؒ) نے ازراہ محبت ایک شخص کے اوپر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ اگر اب کی تم نے ہاتھ لگایا تو میں لٹھ مار دوں گا۔ آپ نے فوراً اس کے پاؤں پکڑ لیئے اور فرمایا کہ "پاؤں کو تو نہیں کہا تھا" اس کے بعد اس کا غصہ کافور ہو گیا اور فوراً نرم پڑ گیا۔ اسی طرح آپ ایک بار ایک میواتی پر تبلیغ کر رہے تھے کہ وہ بگڑ گیا اور آپ کو ایک گھونسہ مار دیا۔ مولانا محمد الیاسؒ دبلے کمزور آدمی تھے، گھونسہ کی تاب نہ لاکر زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر بعد جب اُن کے حواس بجا ہوئے تو وہ گرد جھاڑ کر اُٹھے اور میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا

"اچھا تم تو اپنا کام کر چکے، اب میری سنو۔"

---

[124] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک، دار التذکیر، اُردو بازار لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۰ء، ص ۹، ۱۰۔

یہ دیکھ کر میواتی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور بولا "مولوی مجھے معاف کر ورنہ میری بخشش نہیں ہوگی"[125]۔

مولانا محمد الیاسؒ کے اسی خلوص کا نتیجہ تھا کہ میواتیوں کی کثیر تعداد دین کی طرف مائل ہوئی اور وہ لوگ جو کلمہ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے، مولانا کی دعوت پر اسلام کے مبلغ بن گئے۔ ایک مرتبہ بانی تحریک کے ایک پرانے ساتھی نظام الدین گئے۔ اس وقت مولانا محمد الیاسؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے گھر میں مولانا محمد الیاسؒ کی زوجہ محترمہ کے یہاں کہلا بھیجا کہ مولانا کی کوئی خاص بات جو آپ کو یاد ہو بتایئے۔

محترمہ نے اندر سے کہلایا

"جب میری شادی ہوئی اور میں رخصت ہو کر مولانا کے گھر گئی تو میں نے دیکھا کہ مولانا راتوں کو بہت کم سوتے ہیں اُن کی راتیں بستر پر کروٹ بدلنے اور آہ بھرنے میں گزرتی تھیں۔ میں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ کو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ مولانا نے ایک آہ بھری اور فرمایا۔ کیا بتاؤں اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے تو جاگنے والا ایک نہ رہے، دو ہو جائیں"[126]۔

مندرجہ بالا واقعہ مولانا محمد الیاسؒ کے خلوص اور مسلمانوں کے ساتھ گہرے تعلق کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر ہم حضور ﷺ کی امت کے لئے بے چینی کا مطالعہ کریں تو مولانا محمد الیاسؒ کی بے چینی سمجھ میں آتی ہے۔

ایک مکتوب میں مولانا محمد الیاسؒ لکھتے ہیں:

"ہماری یہ تحریک ایمان جس کی حقانیت کو اہل جہاں تسلیم کر چکے ہیں، اس کے عمل میں آنے کی صورت بجز اس کے کہ ہر آدمی لاکھ جان کے ساتھ قربان ہونے کو تیار ہو اور کوئی ذہن میں نہیں آتی[127]۔

مولانا کے نزدیک جب تک خلوص اور انتھک محنت کے ساتھ لوگوں کو ایمان کی دعوت نہیں

125 حوالہ سابق، ص ۱۳۔

126 حوالہ سابق، ص ۱۴۔

127 مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت، مجلس نشریات اسلام کراچی، سن اشاعت ۱۹۹۸ء، ص ۲۸۶۔

دی جائے گی، اس وقت تک دین کا کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ انہوں نے اپنے عمل سے بھی یہی بات لوگوں کو پہنچائی۔ یہ اُن کی تربیت کا اثر تھا کہ اُن کے پیروکاروں نے پوری دنیا کے سفر کئے اور اللہ کا پیغام دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا۔

تبلیغی جماعت کے اصول

تبلیغی جماعت کی دعوت کے چھ بنیادی اصول ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے فکر و عمل کی بنیاد چھ باتوں پر ہے۔(۱) تصحیح کلمہ (۲) تصحیح نماز(۳) تصحیح علم و ذکر (۴) تفریغ اوقات (۵)اکرام مسلم اور(۶) تصحیح نیت۔

جماعت کی ساری تبلیغی سرگرمیاں انہی اصولوں کے گرد گھومتی ہیں اور کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ ان اصولوں سے بال برابر بھی تجاوز کرے۔ مولانا محمد الیاسؒ کی دعوت دراصل انہی اصولوں کی دعوت تھی اور ان میں بھی وہ خصوصیت کے ساتھ کلمہ، نماز اور علم و ذکر پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ مولانا کی نظر میں ان اصولوں کی جو اہمیت تھی وہ اُن کے اس بیان سے بالکل ظاہر ہے:

"دوستو! اس تبلیغ میں اصولوں کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اگر کسی اصول میں ذرا بھی کوتاہی کروگے تو خدا کا وہ عذاب جو شاید بدیر آئے فوراً ہی تمہارے سر پر آموجود ہوگا"[128]۔

مزید فرمایا

"یاد رہنا چاہیے کہ ہر چیز اپنے اصول اور اپنے طریقہ سے سہل ہوتی ہے۔ غلط طریقہ سے تو آسان سے آسان کام بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اب لوگوں کو یہ غلطی ہے کہ وہ اصول کی پابندی ہی کو مشکل سمجھتے ہیں اور اس سے گریز کرتے ہیں حالانکہ دنیا میں کوئی معمولی سے معمولی کام بھی اصول کی پابندی اور مناسب طریقہ کار اختیار کئے بغیر انجام نہیں پایا۔ جہاز، کشتی، ریل، موٹر سب اصول ہی سے چلتے ہیں حتیٰ کہ ہنڈیا روٹی تک بھی کسی اصول ہی سے پکتی ہے"[129]۔

مولانا محمد الیاسؒ نے جن چھ اصولوں کی تاکید کی اور جن پر وہ اپنی زندگی میں سختی سے کاربند

---

128 مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت، ص ۱۶۰۔

129 محمد منظور نعمانی (مرتب)، ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ، مجلس نشریات اسلام کراچی، سن اشاعت ۱۹۹۵ء، ص ۱۳۔

رہے، ابھی تک تبلیغی جماعت میں رائج ہیں اور جماعت کے مبلغین انہی چھ اصولوں کی حدود میں محدود رہ کر گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن بانی جماعت ان چھ اصولوں کا جو مفہوم اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور جس کا اظہار اُن کے اقوال میں بھی ملتا ہے، موجودہ دور کی تبلیغی جماعت ان اصولوں کا شاید وہ مفہوم پیش نظر نہیں رکھتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ تبلیغی جماعت اپنے بانی کی دعوتی طریقہ کار سے کسی حد تک منحرف ہو چکی ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

تبلیغی جماعت کا پہلا اصول تصحیح کلمہ ہے۔ مولانا محمد الیاسؒ نے کلمہ طیبہ کا مفہوم یوں بیان کیا ہے:

"اس وقت بد قسمتی سے ہم کلمہ تک سے نا آشنا ہو رہے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے اسی کلمہ طیبہ کی تبلیغ ہے جو کہ خدا کی خدائی کا اقرار نامہ ہے یعنی اللہ کے حکموں پر جان دینے کے علاوہ در حقیقت ہمارا کوئی بھی مشغلہ نہ ہو گا"[130]۔

مولانا محمد الیاسؒ کے مندرجہ بالا قول سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اُن کے نزدیک تصحیح کلمہ سے مراد یہ تھی کہ لوگوں کو نہ صرف کلمہ طیبہ کے الفاظ یاد کرائے جائیں بلکہ اُنہیں اللہ کے دین کی خاطر جان کی قربانی دینے کے لئے بھی تیار کیا جائے۔ لیکن یہ بات باعث حیرت ہے کہ اس وقت تبلیغی جماعت کے کارکنان کی توانائیاں صرف کلمہ کے الفاظ کی درستگی پر صرف ہو رہی ہیں اور دین اسلام کا تصور جہاد نظروں سے اوجھل ہے۔ ہر تبلیغی اجتماع میں جس بات پر ساری توجہ مرکوز ہوتی ہے وہ یہ کہ لوگ کثیر تعداد میں چلّے دیں۔ لیکن آج تک کسی اجتماع میں خواہ وہ عالمی اجتماع ہی کیوں نہ ہو، جہاد کی بات کوئی بھی نہیں کرتا اور یہ مولانا محمد الیاسؒ کی تعلیمات سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

تبلیغی جماعت کے دوسرے اصول تصحیح نماز کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جماعت لوگوں کو نمازی بناتی ہے اور نماز کے ظاہری ارکان کی درستگی کا بھی اہتمام کرتی ہے۔ لیکن مولانا محمد الیاسؒ محض ظاہری ارکان کی درستگی کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ مولانا نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا:

"صلوٰۃ اعمال کے اعتبار سے سب سے اہم اور بڑا عمل ہے۔ یہ دروازہ ہے تمام اعمال کا۔ کلمہ طیبہ میں جس چیز کا عہد کیا تھا کہ صرف خدا ہی کو احکم الحاکمین اور اپنا ہر چیز کا مرجع مانوں گا اور اُس کے

130 مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت، ص۲۷۹۔

حکم کے ماتحت اپنی زندگی گزاروں گا، یہ اس کے ثبوت کا پہلا عملی قدم ہے۔ صلوٰۃ کے بھی دو اجزاء ہیں، ایک ظاہری دوم باطنی۔ ظاہری مقدمات صلوٰۃ کو درست اور حسن کے ساتھ ادا کرنا۔ مثلاً وضو کو سنن و مستحبات کے ساتھ کرنا اور اس کو صحیح بنانا اور ہر ہر رکن کو سنت کے مطابق ادا کرنا۔ باطنی، ہر ہر رکن میں خشوع کے کمال کی کوشش کرنا جس سے نماز میں تنہیٰ عن الفحشاء کی صفت پیدا ہو۔ نماز ایک روشندان ہے جس کے ذریعہ سے تمام اعمال پر نورانیت پہنچتی ہے۔ یہ نماز کی روح ہے"[131]

مولانا محمد الیاسؒ کے مندرجہ بالا قول سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے اور قرآن کی تعلیم بھی یہی ہے کہ نماز کے ذریعے انسان بے حیائی اور برائی سے بچتا ہے۔ جب انسان خود برائی سے بچے گا تو یقینی بات ہے کہ برائی اور بے حیائی کو دیکھ کر اُس کا خون کھولے گا اور جس طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "من رایٰ منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فاان لم یستطع فبلسانہ فاان لم یستطع فبقلبہ وزالک اضعف الایمان") ۱۴(۔

۔"تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے تو اُسے اپنے ہاتھ سے روکے اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس برائی کو برا جانے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے اُسے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔

ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ برائی اور بے حیائی کو دیکھ کر اُسے روکنے کی حتی المقدور کوشش کرے۔ لیکن یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ تبلیغی جماعت کے کارکن نمازیں تو خوب پڑھتے ہیں لیکن فحاشی اور برائی پر اُن کی ایمانی غیرت کو بالکل جوش نہیں آتا۔ اُن کی ساری توانائیاں لوگوں کو گھروں سے نکالنے پر صرف ہو رہی ہوتی ہیں۔ حالانکہ بے شمار ایسے لوگ میرے زاتی مشاہدے میں آئے ہیں جو چلے لگانے کے باوجود غلط کاریوں سے باز نہیں آتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعت نے مولانا محمد الیاسؒ کے اقوال کو بھلا دیا ہے اور نماز کی روح پر توجہ نہیں دی جاتی، صرف ظاہر کا خیال رکھا جاتا ہے۔

جماعت کا تیسرا اصول تصحیح علم و ذکر ہے۔ مولانا محمد الیاسؒ کے نزدیک وہی علم دین معتبر ہے جس کا رشتہ عمل سے قائم ہو۔ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی ایک جماعت سے جو مرکز میں مقیم تھی، خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا

---

131 افتخار فریدی (مرتب)، ارشادات و مکتوبات بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب، نوید پبلشرز اُردو بازار لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۸۔

"وہ ہمیشہ اس فکر میں لگے رہیں اور اس فکر کے بوجھ کے ساتھ زندگی گزاریں کہ جو کچھ پڑھا ہے اور جو پڑھیں گے، اس کے مطابق زندگی گزرے۔ علم دین کا یہ پہلا لازم حق ہے۔ دین کوئی فلسفہ اور فن نہیں ہے۔ بلکہ زندگی گزارنے کا وہ طریقہ ہے جو انبیاء لے کر آئے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے "علم لاینفع" (یعنی اس علم سے جو عمل پر نہ ڈالے) سے پناہ مانگی ہے اور اس کے علاوہ بھی عالم بے عمل کے لئے جو سخت وعیدیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں وہ آپ کے علم میں ہیں۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ عالم کی بے عملی نماز نہ پڑھنا اور روزہ نہ رکھنا، شراب پینا یا زنا نہیں ہے۔ یہ تو عام آدمیوں کے گناہ ہیں۔ عالم کا گناہ یہ ہے کہ وہ علم پر عمل نہ کرے اور اس کا حق ادا نہ کرے"[132]۔

اگرچہ مولانا محمد الیاسؒ نے علم اور عمل پر بہت زور دیا لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے کارکنان کو قرآن مجید کے فہم وادراک کی طرف راغب نہ کر سکے۔ رسول ﷺ نے لوگوں کو دین کی طرف دعوت دینے کے لئے قرآن مجید کو ذریعہ ہدایت کے طور پر پیش کیا۔

تبلیغی جماعت نے کبھی بھی قرآن مجید کو تبلیغ کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ یہ تاثر کافی حد تک حقیقت پر مبنی ہے کہ جماعت کے بزرگ قرآن مجید کو ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ تبلیغی جماعت میں جو مقام فضائل اعمال نامی کتاب کا ہے وہ مقام شائد قرآن مجید کو بھی حاصل نہیں۔ مساجد میں باقاعدگی سے فضائل اعمال سے درس دیا جاتا ہے لیکن قرآن مجید کا درس تبلیغی جماعت کی شاید ہی کسی مسجد میں ہوتا ہو۔ جہاں تک ذکر کا تعلق ہے، بلاشبہ تبلیغی جماعت میں اذکار کا اہتمام کیا جاتا ہے اور خاص طور پر ایک تسبیح سوئم کلمہ کی صبح کو اور ایک شام کو اور درود واستغفار کی دو دو تسبیح روزانہ کا معمول اکثر تبلیغی کارکنان میں نظر آتا ہے۔ لیکن اگر نفلی اذکار کے ساتھ ساتھ مسنون اذکار کا بھی اہتمام کیا جائے تو زیادہ افادیت ہو گی۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ تبلیغی جماعت میں بزرگوں کے اقوال اور معمولات قرآن وحدیث پر فوقیت رکھتے ہیں اور اصحاب تبلیغ نے تبلیغی نصاب اور ذکر نفلی کو حقیقی علم وذکر سمجھ لیا ہے۔

تبلیغی جماعت کا چوتھا اصول تفریغِ وقت ہے۔ موجودہ تبلیغی جماعت اس اصول پر پہلے ہی کی

---

132 مسلم بن حجاج بن مسلم قشیری، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان، ح: ۴۹، دارالاشاعت کراچی، پاکستان۔

طرح کار بند ہے۔ لوگ اپنا وقت تبلیغ کی خاطر نکالتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی جماعت میں ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگیاں تبلیغ کی خاطر وقف کی ہوئی ہیں۔ لوگوں کو سہ روزہ، چلہ یعنی چالیس دن، چار ماہ وغیرہ کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ لوگوں کی قربانیاں ہی ہیں کہ آج دنیا کے ہر کونے میں تبلیغی جماعت پہچانی جاتی ہے۔

پانچواں اصول اکرام مسلم ہے۔ بلاشبہ یہ ایک عمدہ اصول ہے۔ اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد الیاس فرماتے ہیں:

"ہر شخص میں یقیناً کچھ خوبیاں اور کچھ خرابیاں ہوتی ہیں مگر خرابیوں کے ساتھ نظر اندازی اور پردہ پوشی کا اور خوبیوں کی پسندیدگی اور اُن کے اکرام کا ہم مسلمانوں میں رواج پڑ جائے تو بہت سے فتنے اور بہت سی خرابیاں اپنے آپ دنیا سے اُٹھ جائیں اور ہزاروں خوبیوں کی اپنے آپ بنیاد پڑ جائے مگر دستور اس کے خلاف ہے"[133]۔

تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاسؒ کی مندرجہ بالا ہدایت پر کسی حد تک عمل پیرا ہیں۔ جہاں تک جماعت کے پرانے رفقاء کا تعلق ہے، اُن میں یقینا اکرام مسلم کا جذبہ موجود ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس مسجد میں تبلیغی جماعت کا کنٹرول ہو، وہاں کسی اور جماعت کو کوئی دینی پروگرام کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ معلوم نہیں اکرام مسلم کا اصول اُس وقت کیوں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے جب دوسری جماعت کے افراد کو دھمکیاں دے کر مسجد میں درس قرآن کا پروگرام کرنے سے روکا جاتا ہے۔ شاید ہماری مذہبی جماعتوں کا یہی کمزور کردار ہے جس کی بدولت امت مسلمہ زوال سے دوچار ہے۔ بدقسمتی سے قول اور فعل کا تضاد تبلیغی جماعت میں بھی موجود ہے اور یہ اکرام مسلم کے دینی تصور کے بالکل خلاف ہے[134]۔

تبلیغ کا چھٹا اور آخری اصول تصحیح نیت ہے۔ یعنی جو بھی کام کیا جائے اس میں نیت رضائے الٰہی ہونی چاہیے۔ مولانا محمد الیاسؒ فرماتے ہیں:

"ہر عمل کے بارے میں اللہ نے جو وعدے، وعید فرمائے ہیں ان کے موافق اس امر کی تعمیل

---

133 ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس، ص، ۱۳۰۔

134 حوالہ سابق، ص ۸۱، ۸۲۔

کے ذریعے اللہ کی رضا اور موت کے بعد والی زندگی کی درستی کی کوشش کرنا"[135]

تبلیغی جماعت کے افراد ہمیشہ اپنے خرچے پر سفر کرتے ہیں اور دوران تبلیغ لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں بھی برداشت کرتے ہیں۔

مولانا محمد الیاسؒ نے جس اخلاص کا درس اپنے پیروکاروں کو دیا تھا اُس کی واضح جھلک آج بھی جماعت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ بڑے سے بڑا افسر بھی تبلیغی دورے کے دوران لوگوں کی ڈانٹ صبر سے برداشت کرتا ہے کیونکہ اُس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ مجھے اللہ کی رضا حاصل ہو جائے گی۔

تبلیغی جماعت اور علماء کا کردار

مولانا محمد الیاسؒ (۱۸۸۵ء۔ ۱۹۴۴ء) کی یہ شدید خواہش تھی کہ علماء کرام دعوت و تبلیغ کے کام کی سرپرستی کریں۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر علماء نے اس کام کو نظر انداز کیا اور عام افراد کے ہاتھوں میں تبلیغ کی باگ ڈور رہی تو اس سے شدید نقصان ہو گا۔ وہ اکثر اپنی محفلوں میں یہ کہتے تھے کہ علماء اپنی خداداد صلاحیتیں اس کام میں لگائیں۔ چونکہ مولانا محمد الیاسؒ خود بھی ایک عالم دین تھے اس لیے انہیں مدارس اور علماء کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا، مدارس کی پڑھائی کو بھی متاثر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ایک خط میں مولانا محمد الیاسؒ لکھتے ہیں۔

"اگر میری تحریک کی وجہ سے علمی حرج ہو تو یہ ایک بہت بڑا نقصان ہو گا۔ تبلیغ سے میرا یہ قطعاً مقصد نہیں ہے کہ مدارس کے طلباء کی پڑھائی متاثر ہو"[136]۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳ء۔ ۱۹۴۳ء) کی یہ رائے تھی کہ وہ علماء جنھوں نے آٹھ سے دس سال تک دین کی تعلیم حاصل کی ہوتی ہے، جب کسی تبلیغی دورے پر جاتے ہیں تو بعض اوقات انہیں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو ایسے حالات میں یہ اَن پڑھ اور جاہل میواتی جن کی کوئی تربیت بھی نہیں کیا کریں گے؟ لیکن جب انہیں مسلسل یہ اطلاعات ملیں کہ تبلیغی گروہ علماء کی سرپرستی میں کام کر رہے ہیں اور ایسی باتیں نہیں کرتے جن سے اُنہیں منع کیا گیا ہے۔ تو اس پر وہ (یعنی مولانا اشر

---

[135] مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت، ص ۲۸۰۔

[136] http://www.darsequran.com/articles/english/tablighi jamat.php

ف علی تھانویؒ) مطمئن ہو گئے۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۸۷۹ء۔۱۹۵۷ء) کا سیاست سے تعلق کوئی راز کی بات نہیں تھی۔ اگرچہ انہوں نے جماعت کے ساتھ وقت نہیں لگایا تھا لیکن پھر بھی وہ اپنے سیاسی جلسوں میں تبلیغی جماعت کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء) تبلیغی جماعت کے ساتھ بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ایک دن علی میاںؒ نے کہا:

"اگرچہ ندوہ نے ہمیشہ دیندار لوگوں کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا ہے، لیکن انہیں شاید ہی کبھی مثبت جواب ملا ہو، خدا کا شکر ہے کہ مولانا محمد الیاس اُن سے محبت کرتے ہیں"۔ مولانا محمد منظور نعمانی (م: ۱۹۹۷ء) اور مولانا عبد القادر رائے پوری بھی مولانا محمد الیاس کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے[137]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دار لعلوم دیو بند سے تعلق رکھنے والے علماء نے تبلیغی جماعت کے ساتھ بھر پور تعاون کیا ہے جس کے نتیجے میں بلا مبالغہ لاکھوں افراد اس جماعت سے وابستہ ہوئے ہیں۔ اگر کسی بھی موقع پر علماء نے جماعت سے تعاون ختم کیا تو یہ تبلیغی جماعت کے لئے بہت بڑا المیہ ہو گا۔ یہاں پر اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بریلوی مکتب فکر، سلفی مکتب فکر اور اہل تشیع کے علمائے کرام تبلیغی جماعت سے اعلان برأت کرتے ہیں اور اپنی مساجد میں تبلیغی جماعت کے افراد کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ کیونکہ ان مسالک کے علماء یہ سمجھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت کے افراد ضعیف احادیث بیان کرتے ہیں اور قوم کو گمراہ کر رہے ہیں نیز جماعت پر مسلک کے پرچار کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ علماء کرام کی طرف سے لگائے گئے دونوں اعتراضات کو یکسر نظر انداز کرنا خاصا مشکل ہے۔

تبلیغی جماعت اور خواتین کا کردار

اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت کا کام جس طرح مردوں پر لازم کیا ہے بعینہ یہ کام عورتوں پر بھی فرض ہے۔ آنحضور صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی ازواج کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تبلیغی جماعت میں جہاں مردوں کے قافلے دربدر پھرتے ہیں اور لوگوں کو کلمہ، نماز وغیرہ کی تلقین کرتے ہیں، وہیں پر عورتوں کی جماعتیں بھی روانہ کی جاتی ہیں جو مختلف علاقوں میں خواتین کی تربیت کرتی ہیں۔ غیر ممالک مثلاً فرانس، امریکہ، افریقہ وغیرہ سے خواتین (مستورات) کی جماعتیں پاکستان اور دیگر ممالک میں آتی ہیں جبکہ یہاں سے جماعتیں اُن ممالک میں جاتی ہیں۔ خواتین کے اجتما

[137] .Ibid.

عات بھی منعقد کئے جاتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی خواتین مساجد میں نماز بھی ادا کرتی ہیں۔ کراچی کی مکی مسجد میں ہر جمعے کو ظہر سے عصر تک خواتین اکٹھی ہوتی ہیں۔

Barbara metcalf اپنے ایک مضمون Women in the tablighi Jama'at میں لکھتی ہیں کہ

"At a meeting i attended in July 1991 at the Makki Masjid, a woman and a man addressed a crowd of approximately a thousand women over a loudspeaker."[138]

"جولائی 1991ء میں میں نے مکی مسجد کے ایک اجتماع میں شرکت کی، ایک مرد اور عورت نے تقریباً ایک ہزار خواتین سے بذریعہ لاؤڈ سپیکر خطاب کیا۔"

Barbara Metcalf ایسے اجتماعات کی افادیت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

"In these settings, women from humble backgrounds may take on roles of leaderships and guidance for others."[139]

"ان اجتماعات کے ذریعے عام طبقات کی خواتین کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے قیادت اور رہنمائی کا کردار ادا کر سکیں۔"

تبلیغی جماعت کے افراد اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جماعت کے بانی امیر مولانا محمد الیاسؒ نے خواتین میں تبلیغ کے کام کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اُن کی ہدایت پر اُن کے قریبی ساتھی مولانا عبد السجان کی بیوی نے دہلی میں تبلیغ کا کام شروع کیا اور ایک اجتماع منعقد کیا جس میں خواتین اپنے محارم کے ساتھ شریک ہوئیں۔ اگرچہ اس وقت دیگر علماء کرام نے عورتوں کے تبلیغ کرنے کے عمل کی مخالفت کی لیکن مولانا محمد الیاس نے آہستہ آہستہ اُن علماء کی ہمدردیاں حاصل کر لیں[140]۔

تبلیغی جماعت کے برعکس مذہبی سیاسی جماعتیں خواتین کے تبلیغی رول کو قبول نہیں کرتیں۔ مثلاً جماعت اسلامی جس کی بنیاد مولانا مودودی مرحوم (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۹ء) نے ۱۹۴۳ء میں رکھی، خواتین

---

[138] http: //www.stanford.edu/group/SHR/5-1/text/metcalf/html

[139] ایضا.

[140] سید عبد الشکور ترمذی، دعوت و تبلیغ کی شرعی حیثیت، ادارہ اسلامیات لاہور، سن اشاعت ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

کے بارے میں یہ نقطہ نظر رکھتی ہے کہ اُنہیں اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو اسلام کے مطابق ادا کرنے کی کو شش کرنی چاہیے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی اپنی کتاب پردہ میں عورت کے دائرہ عمل کی وضاحت کرتے ہو ئے لکھتے ہیں کہ: ”اس (یعنی عورت) کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کیا گیا ہے جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ مثلاً

(i) اس پر نماز جمعہ واجب نہیں (ابو داؤد، باب الجمعہ للملوک والمراۃ)

(ii) اس پر جہاد بھی فرض نہیں، اگرچہ بوقت ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لئے جا سکتی ہے۔

(iii) اس کے لئے جنازوں کی شرکت بھی ضروری نہیں، بلکہ اس سے روکا گیا ہے۔ (بخاری، باب اتباع النساء الجنائز)

(iv) اس پر نماز باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی۔ اگرچہ چند پابندیوں کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت ضرور دی گئی ہے۔ لیکن اس کو پسند نہیں کیا گیا۔

(v) اس کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی المراۃ تحج ب (ترمذی، باب ماجاء فی کراہیتہ ان تسافر المراۃ وحدھا۔ ابو داؤد باب فیغیر محرم)

غرض ہر طریقے سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لئے قانون اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے“[141]۔

مولانا مودودیؒ کے بیان کردہ محولہ بالا موقف سے اگرچہ جماعت اسلامی انحراف کر چکی ہے اور جماعت کی خواتین سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہی ہیں۔ تاہم جماعت اسلامی اب بھی تبلیغی جماعت کے اس طریقہ کار سے اتفاق نہیں کرتی کہ خواتین کئی کئی دنوں کے لئے اپنے گھروں کو چھوڑ کر دعوت دین کا کام کریں۔ جماعت اسلامی کی سرکردہ رہنما سمیعہ راحیل قاضی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ”عورت کا اصل دائرہ کار اس کا گھر ہے۔ ہمارا سیاست میں حصہ لینا با امر مجبوری ہے۔ جیسے ہی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ ہم اپنے اصل دائرے میں لوٹ جائیں گی[142]“۔ اگر تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کے مو

---

141 سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، پردہ، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، سن اشاعت اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔

142 انٹرویو، سمیعہ راحیل قاضی، روزنامہ نوائے وقت ملتان، سنڈے میگزین، اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۔

جو دہ نظریے کا موازنہ کیا جائے تو دونوں میں جھول محسوس ہوتا ہے۔ اسلام نہ تو عورت کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں اسلام کی تبلیغ کرتی پھرے اور نہ ہی اسلام کسی مجبوری کو تسلیم کرتا ہے جس کی وجہ سے عورت گھر کا چراغ بننے کی بجائے شمع پارلیمنٹ بن جائے۔ اسلام نے مسلمانوں کو الاقرب فالاقرب کا اصول عطا کیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وانذر عشیرتک الاقربین" (الشعراء:۲۱۴)

"اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔"

اسی اصول کے تحت رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے خاندان والوں کو دین کی دعوت دی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورتوں پر بھی دین کی تبلیغ لازم ہے۔ لیکن شریعت کا منشا یہ ہے کہ عورتیں اپنے گھر میں موجود عورتوں کو دین کی دعوت دیں اور اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے اپنی دعوت کے دائرے کو بڑھائیں۔ اس دوران کسی لمحے بھی اُن کے ذہنوں سے یہ بات محو نہیں ہونی چاہیے کہ اُن کا اصل دائرہ کار اُن کا گھر ہے۔ سیرت النبی ﷺ کے مطالعے سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس طرح مردوں نے دعوت و تبلیغ کے کام میں کٹھن مراحل کو عبور کیا اور دور دراز کے سفر کئے، عورتوں کے ساتھ بالعموم ایسا معاملہ نہیں ہوا کیونکہ عورت کی اصل ذمہ داری اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت اور گھر کی دیکھ بھال ہے۔

۷ھ میں غزوہ خیبر پیش آیا۔ اس غزوہ سے متعلق یہ واقعہ کتب حدیث میں موجود ہے۔ جس سے غزوہ خیبر میں خواتین کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اس واقعے کو امام احمدؒ بن محمد بن حنبل (م:۲۴۱ھ) نے اپنی مسند اور امام ابو داؤد سلیمان بن اشعثؒ (م:۲۷۵ھ) نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

"حشرج بن زیاد عن جدتہ ام ابیہ انھا خرجت مع رسول اللہ ﷺ فی غزوۃ خیبر سادس ست نسوۃ فبلغ رسول اللہ ﷺ فبعث الینا فجئنا فراینا فیہ الغضب فقال مع من خرجتن وباذن من خرجتن فقلنا یارسول اللہ خرجنا نغزل الشعر و نعین بہ فی سبیل اللہ ومعنا دواء الجرحی ونناول السھام و نسقی السویق فقال قمن

حتی اذا فتح اللہ علیہ خیبر اسھم لنا کما اسھم للرجال قال قلت لھا یا جدۃ وما کان ذلک فقالت تمراً۔[143]

"حشرج بن زیاد اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ غزوہ خیبر کے موقع پر آنحضور ﷺ کے ساتھ چھ خواتین کے ہمراہ باہر نکلیں، جن میں چھٹی وہ خود تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب حضور ﷺ کو ہمارے نکلنے کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے ہمیں بلوایا۔ جب ہم حاضر ہوئیں تو آپ ﷺ کو غضبناک پایا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تم کس کے ساتھ نکلی ہو اور کس کی اجازت سے نکلی ہو؟ ہم نے عرض کیا: ہم اون کاتیں گی اور کچھ اللہ کی راہ میں کام کریں گی۔ ہمارے پاس کچھ مرہم پٹی کا سامان ہے۔ ہم (مجاہدین کو) تیر پکڑا دیں گی، انہیں ستو گھول کر پلا دیں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اٹھو، واپس چلی جاؤ! پھر جب اللہ نے خیبر فتح کرا دیا تو حضور اکرم ﷺ نے (مال غنیمت میں سے) ہمارے لئے بھی مردوں کی طرح حصہ نکالا۔ حشرج کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: دادی جان! (مال غنیمت میں سے) کیا چیز ملی تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا: کچھ کھجوریں!"۔

اس حدیث میں رسول ﷺ کا ان خواتین سے یہ استفسار کہ تم کس کے ساتھ نکلی ہو اور کس کی اجازت سے نکلی ہو بہت اہم ہے۔ اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ کوئی خاتون اگر کہیں باہر نکلتی ہے تو سب سے پہلے اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ اس کے ساتھ محرم ہے یا نہیں؟ سیرت کا یہ اہم واقعہ ہماری خواتین کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے فریضہ اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد مردوں پر فرض کی ہے اور عورتوں پر یہ ذمہ داری براہ راست عائد نہیں کی۔ البتہ خواتین سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اس جدوجہد میں اپنے مردوں کی معین و مددگار ہوں۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کو اپنی ذمہ داری سمجھیں اور مردوں پر اس کا زیادہ بوجھ نہ پڑنے دیں۔ وہ مردوں کے لئے اس راہ میں زیادہ سے زیادہ وقت فارغ کرنا ممکن بنائیں۔ اُن پر اپنی فرمائشوں کا بوجھ اس طرح نہ لاد دیں کہ وہ انہی مسائل میں الجھ کر رہ جائیں اور دین کی سربلندی کے لئے جہد و کوشش نہ کر سکیں۔ خواتین اگر ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے شوہروں سے تعاون کریں تو یہ اُن کی طرف سے اقامت دین کی جدوجہد میں شرکت کا بدل بن جائے گا اور اُن کے

---

143 ابو داؤد سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی المرأۃ والعبد یحذیان من الغنیمۃ، ح:۲۷۲۹، مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔

لئے اجر کثیر اور ثواب عظیم کا باعث ہو گا۔ اور خواتین کے لئے اس سے بڑھ کر خوش آئند بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انہیں گھر بیٹھے بٹھائے مردوں کے برابر اجر و ثواب مل جائے!!

تبلیغی جماعت کی فکر کا تنقیدی جائزہ

تبلیغی جماعت اس وقت مسلم دنیا کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ دنیا کے ہر کونے تک تبلیغی جماعت کے کارکن اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ پاکستان میں وہ علاقے جہاں دین سے دوری کا یہ عالم ہے کہ مساجد میں بلیوں اور کتوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں یہ تبلیغی جماعت کے افراد ہی ہیں جو ایسی مساجد کو آباد کرتے ہیں۔ میرے ذاتی علم میں ایسی مسجد ہے جہاں کتیا نے بچے دیے ہوئے تھے، تبلیغی جماعت وہاں پہنچی اور مسجد کو آذان و نماز سے آباد کیا۔ بلاشبہ یہ مساعی قابل تحسین ہیں۔ بے شمار افراد اسی جماعت کی بدولت شراب اور بدکاری چھوڑ کر نمازی بن جاتے ہیں۔ ایک خاص ماحول میں رہنے سے ان پر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ برے کام چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس جماعت کی بدولت بے شمار افراد نمازی بنے ہیں لیکن یہ سوال بھی اپنی جگہ بے حد اہم ہے کہ کیا افراد کے نمازی بننے سے دین اسلام کو بطور نظامِ زندگی بھی فائدہ پہنچا یا نہیں؟ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کے اثر و نفوذ سے دین اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے فائدہ نہیں پہنچا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اس جماعت نے اسلام کو دین نہیں بلکہ مذہب سمجھا ہے جس کی وجہ سے یہ جماعت حضور ﷺ کے اسوہ سے ہٹ گئی ہے۔ دین اسلام نہ صرف عبادات اور عقائد سے بحث کرتا ہے بلکہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی اُمور میں بھی مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اگر حضور اکرم ﷺ صرف عبادات پر ہی زور دیتے تو مشرکین مکہ کبھی بھی آپ ﷺ کی مخالفت نہ کرتے۔ مشرکین مکہ نے آپ کی مخالفت اس لئے کی کہ آپ اس نظام کو چیلنج کر رہے تھے جس نظام نے غیر اللہ کی حاکمیت کو جائز قرار دیا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے تبلیغی جماعت ظالمانہ نظام کو بدلنے کی بالکل بات نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت کے مقررین کبھی بھی نہ تو اسلام کے معاشی نظام پر گفتگو کریں گے اور نہ سیاسی نظام زیر بحث لائیں گے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کو اسلام دشمن ممالک میں بھی کام کرنے کی اجازت ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس جماعت کے ذریعے ہمارے سیاسی نظام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اس جماعت سے سب سے بڑی بھول یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کو تبلیغ کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ ایک ایسی کتاب (فضائل اعمال) کو ذریعہ بنایا ہے

جس میں ضعیف روایات اور حکایات کی بھرمار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جماعت، قرآن مجید کی طرف رجوع کرے اور اسلام کو بطور دین اختیار کرے نہ کہ بطور مذہب۔ حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید کو ذریعہ تبلیغ بنایا تھا۔ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اختیار کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ [144]

پس قرآن کے ذریعے اس شخص کو نصیحت کیجیے جو میرے وعدہ عذاب سے ڈرتا ہے۔ تبلیغی جماعت کے کارکنان کے علمی معیار کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت اَن پڑھ یا کم تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تبلیغی جماعت کے مبلغین اکثر بے سروپا قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ ایک تبلیغی بزرگ نے مجھے بتایا کہ ایک مبلغ نے دوران "بیان" (یعنی تقریر) قمیض کے کالروں کو جب غیر اسلامی کہا تو تبلیغی بھائیوں نے فوراً کالروں کو کاٹنا شروع کر دیا۔" جب اس قسم کے سطحی سوچ والے لوگ ایک جماعت میں اکثریت میں ہوں گے تو دین کے صحیح تصور کا ابلاغ امر محال ہو جائے گا۔

---

144 ق:۴۵

چوتھا باب: دعوت اسلامی

بانی دعوت اسلامی کا تعارف

دعوت اسلامی کے امیر مولانا محمد الیاس قادری ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ بمطابق ۱۹۵۰ء کراچی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حاجی عبد الرحمٰنؒ (م: ۱۹۵۱ء) آپ کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا اس وقت آپ کے والدین اپنے آبائی گاؤں "کتیانہ" (جونا گڑھ) میں مقیم تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مل جل کر مسلمانوں کو خوب لوٹا۔ ان نامساعد حالات میں مولانا محمد الیاس قادری کے والدین ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ ابتداً کچھ عرصہ حیدر آباد (سندھ) میں قیام کیا اور پھر کراچی منتقل ہو گئے۔ آپ کے والد نے ایک فرم میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس فرم کی ایک شاخ "سیلون" کے دارالخلافہ "کولمبو" میں بھی تھی لہذا ان کا تبادلہ "کولمبو" کر دیا گیا۔ مولانا محمد الیاس ابھی شیر خوار ہی تھے کہ آپ کے والد حج کرنے کے لیے گئے اور وہیں پر ۱۴

ذوالحجۃ الحرام ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء میں انتقال ہو گیا۔ مولانا محمد الیاس قادری کے بڑے بھائی محترم عبد الغنی صاحب نے جوانی تک آپ کا ساتھ دیا۔ پھر وہ ایک ٹرین کے حادثہ میں انتقال کر گئے۔ اپنے بھائی کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد والدہ نے بھی دم توڑ دیا۔ ان حالات میں مولانا محمد الیاس قادری نے سنتوں کے احیاء اور بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عشق رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ اخلاق حسنہ کی نعمت سے بھی مالا مال کیا ہے۔ آپ چھوٹے بڑے سبھی سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے ہیں ایسے ایسے معاملات جہاں اکثر لوگ غصے سے بے قابو ہو جاتے ہیں وہاں آپ مسکراتے رہتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً مبلغین کو بھی یہ نصیحت فرماتے رہتے ہیں کہ اگر تمہیں دین کا کام کرنا ہے تو غصے کو تین طلاق دے دو۔ مولانا محمد الیاس قادری کی صفت عفو و درگزر کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے معتقدین سے کبھی کبھی فرماتے ہیں کہ "بالفرض اگر کوئی مجھے قتل بھی کر دے تو میرے قاتل کو کچھ مت کہنا۔ کیونکہ میں اپنی ذات کے متعلق ہر ایک آنے والی تنگی و مصیبت خواہ وہ کسی بھی مسلمان بھائی کی طرف سے ہو، پیشگی معاف کر چکا ہوں۔ بلکہ کل بروزِ قیامت اگر مجھے کوئی منصب و جاہت سرکار ﷺ کے صدقہ سے ملا تو اپنے قاتل کو جنت میں لیے بغیر نہیں جاؤں گا جبکہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہو۔ کیونکہ اگر یہ قتل نہ کرتا تو مجھے جام شہادت نصیب نہ ہوتا۔ لہذا میں اپنے جام شہادت

پلانے والے محسن کے احسان کا بدلہ کیوں نہ دوں؟" اتباع سنت کا جذبہ آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اتباع سنت کی نیت سے کبھی فرش پر لیٹتے ہیں تو کبھی چٹائی پر۔ آپ نے اپنے سونے کے لیے نہ تو اپنے گھر میں کوئی نرم بستر رکھا ہوا ہے نہ ہی پلنگ۔ حقوق العباد کے معاملہ میں آپ کی نہایت درجہ احتیاط کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب آپ کراچی کی ایک مسجد میں پنجوقتہ نماز کی امامت کرتے تھے۔ مسجد کے حجرے کے لیے اپنے نام کی پلیٹ لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ آپ نے تحریری طور پر اپنا نام "محمد الیاس قادری رضوی" پینٹر کے حوالے کیا اور اجرت بھی طے کرلی۔ جب آپ پلیٹ لینے گئے تو پینٹر کے نوکر سے کہا کہ وہ قادری رضوی کے ساتھ ساتھ "ضیائی" کا لفظ بھی بڑھادے۔ چنانچہ اس نے لفظ "ضیائی" بڑھادیا۔ آپ پہلے سے طے شدہ اجرت ادا کرکے واپس لوٹے۔ پھر اچانک خیال آیا کہ مجھ سے تو حق تلفی ہوگئی ہے۔ یعنی اجرت طے کرنے کے بعد لفظ "ضیائی" وہ بھی ملازم سے بغیر اجازت پینٹر لکھوایا ہے اور ظاہر ہے اجرت طے ہونے کے بعد کسی لفظ کے اضافہ کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ پھر اس اضافہ میں رنگ استعمال ہوا اور اس ملازم کا وقت بھی صرف ہوا۔ آپ پریشان ہوگئے اور دوبارہ پینٹر کے پاس آکر اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ مہربانی کرکے مزید پیسے لے لیں یا زیادتی لفظ کا اضافہ معاف کردیں۔ خدا ترسی کا یہ انداز دیکھ کر پینٹر ہکا بکا رہ گیا[145]۔

مولانا محمد الیاس کے حالات زندگی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء سے ہی اللہ رب العزت نے انہیں تقویٰ کی صفت سے متصف کیا تھا۔ جو شخص بھی دین کی دعوت کا کام کرنا چاہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی عظمت اپنے دل میں بٹھائے رکھنے کے ساتھ ساتھ عفو و درگزر کی صفت سے بھی مالامال ہو۔ جب ہم مولانا محمد الیاس کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ صفت بھی بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ لیکن ان کا یہ کہنا کہ "کل بروز قیامت اگر مجھے کوئی منصب و جاہت سرکار ﷺ کے صدقہ سے ملا تو اپنے قاتل کو جنت میں لیے بغیر نہیں جاؤں گا جبکہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہو"۔ محل نظر ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس موقع پر حد اعتدال سے تجاوز کر رہے ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے فرمایا ہے۔

---

145 مولانا محمد الیاس قادری، تعارف از مفتی نیاز احمد سلیمانی قادری، فیضان سنت، ناشر مکتبہ المدینہ شہید مسجد کھارادر کراچی، ت۔ن، ص ۶ تا ۳۱۔

من قتل نفساً بغیر نفس او فساد افی الارض فکانما قتل الناس جمیعا۔ (المائدہ: ۳۲)

ترجمہ: جس نے کسی انسانی جان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا"۔

جب ایک شخص ایک مسلمان کو قتل کر رہا ہے تو اس کو جنت میں لیجانے کی خواہش کرنا چہ معنی دارد۔ پھر یہ کہ مولانا، قیامت کے روز منصب و جاہت کے بھی خواہش مند نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ایک مسلمان کو تو ہر وقت اپنے خاتمہ ایمان کے بارے میں فکر مند رہنا چاہئے۔ ایک حدیث مبارکہ میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

عن عبد اللہ قال: حدثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو الصادق المصدوق قال: ان احدکم یجمع فی بطن امہ اربعین یوماً، ثم یکون علقۃً مثل ذلک، ثم یکون مضغۃً مثل ذلک، ثم یبعث اللہ ملکاً فیؤمر بأربعٍ: برزقہ، واجلہ، وشقی، اوسعید، فواللہ ان احدکم اوالرجل یعمل بعمل اھل النار حتٰی مایکون بینہ وبینھا غیر باعٍ اوذراعٍ فیسبق علیہ الکتاب فیعمل بعمل اھل الجنۃ فیدخلھا، وان الرجل لیعمل بعمل اھل الجنۃ، حتٰی مایکون بینہ وبینھا غیر ذراعٍ، اوذراعین فیسبق علیہ الکتاب فیعمل بعمل اھل النار فیدخلھا[146]۔

"عبد اللہؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بتایا کہ آپؐ سچے اور تصدیق کیے گئے ہیں کہ تم میں سے ہر آدمی کا مادہ تخلیق چالیس دن تک اس کی ماں کے پیٹ میں قطرہ آب کی صورت میں محفوظ رہتا ہے۔ پھر منجمد خون بن جاتا ہے اتنے ہی دنوں تک اور پھر گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے اتنی ہی مدت تک کے لیے پھر اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے اور پھر اسے چار باتوں کے لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ وہ اس کا رزق، اس کی عمر اور یہ بات لکھتا ہے کہ وہ بد نصیب ہے یا خوش نصیب۔ پس قسم ہے خدا کی تم میں سے کوئی آدمی دوزخ والوں جیسے کام کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر اس پر نوشتہ تقدیر غالب آجاتا ہے اور پھر جنتیوں جیسے عمل کرتا ہے۔ پس وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے اور یقیناً تم میں سے کوئی جنتیوں جیسے کام کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ یا دو ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر نوشتہ تقدیر اس پر

146 محمد بن اسماعیل بخاریؒ، صحیح بخاری، کتاب القدر، ح: ۶۵۹۴، دار الاشاعت کراچی، پاکستان۔

غالب آجاتا ہے تو وہ دوزخ والوں جیسے کام کرنے لگے جاتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے"۔

محولا بالا حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ کسی نیکی پر فخر اور غرور نہیں کرنا چاہئے بلکہ انسان کو ہر وقت اپنے اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارنی چاہیے۔ مبادا کسی عمل پر گرفت ہو جائے۔ یہ بات انتہائی خطرناک ہے کہ انسان آخرت میں منصب وجاہت کی طلب کرتا پھرے۔ اس سے جہاں انسان کے اندر تکبر کا احساس پیدا ہوتا ہے وہیں حضرات صحابہ کے عمل کی بھی نفی ہوتی ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ ہمیشہ آخرت میں بخشش کی طلب کیا کرتے تھے نہ کہ منصب وجاہت کی۔

دعوت اسلامی کا تعارف

دعوت اسلامی کا آغاز ۱۴۰۱ھ بمطابق ۱۹۸۱ء باب المدینہ کراچی (پاکستان) میں ہوا[147]۔ یہ ایک غیر سیاسی عالمگیر تحریک ہے جس کا مقصد دعوت اسلامی کے قائدین کے نزدیک قرآن و سنت کی تبلیغ ہے۔ دعوت اسلامی اپنا پیغام دنیا کے کئی ممالک تک پہنچاچکی ہے۔ جن کی تعداد اس وقت ۵۱ ہے [148]۔ اس تحریک کے مبلغ غیر مسلم ممالک میں بھی دین کی دعوت کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۴ء کے آخری دو تین ماہ میں ساؤتھ افریقہ کے اندر دعوت اسلامی کے مبلغین کی انفرادی کوششوں کے نتیجے میں کم و بیش ۱۰۰ غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا[149]۔ دعوت اسلامی کے زیر انتظام نہ صرف لڑکوں اور لڑکیوں کی دینی تعلیم کے مراکز کام کر رہے ہیں بلکہ گونگے اور بہرے مسلمانوں کو نمازی اور سنتوں کا عادی بنانے کے لئے مجالس بھی قائم ہیں۔ ہفتہ وار اجتماعات میں ہونے والے بیانات کا اشاروں کے ذریعے اُن کو مفہوم بتایا جاتا ہے اور اُن کو اِشاروں کے ذریعے سنتیں سکھائی جاتی ہیں۔ یعنی یہ سکھایا جاتا ہے کہ کھانے کا مسنون طریقہ کیا ہے۔ پانی پینے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اُن کے قافلے بھی سنتوں کی تربیت کے لئے سفر کرتے ہیں۔ اُن میں اشاروں کے ذریعے دینی کام کرنے کے لئے مبلغین کو خاص طور پر تربیت دی جاتی ہے۔ دعوت اسلامی میں حضور اکرم ﷺ

---

147 دعوت اسلامی کا تعارف، پیشکش مرکزی مجلس شوریٰ (دعوت اسلامی)، شہید مسجد، کھارادر، باب المدینہ کراچی، پاکستان، سن اشاعت ۲۰۰۴ء، ص ۱۔

148 حوالہ سابق، ص ۳۔

149 حوالہ سابق، ص ۴۔

کے روزمرہ کے معمولات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اقامت دین کے حوالے سے آپ ﷺ کی سنت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

دعوتِ اِسلامی کے زیر اہتمام عالم و مفتی کورس:۔

دعوت اسلامی کے زیر انتظام کئی جامعات بنام جامعۃ المدینہ قائم کی گئی ہیں، جہاں سے کثیر تعداد میں مبلغین درس نظامی (عالم کورس) کرکے دنیا کے مختلف ممالک میں دعوت اسلامی کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ یہ کورس آٹھ سالہ ہوتا ہے اور اس میں درس نظامی کا مروجہ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ جامعۃ المدینہ سے سند فراغت حاصل کرنے والے علماء اپنی شناخت کے لئے اپنے نام کے ساتھ مدنی لکھتے ہیں۔ جامعۃ المدینہ میں "تخصص فی الفقہ" (مفتی کورس) کا سلسلہ بھی ہے۔

دارالافتاء کا قیام

دعوت اسلامی کے علماء دارالافتاؤں میں بالمشافہ اور ٹیلیفون کے ذریعے نیر بذریعہ ڈاک مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے فتاویٰ کمپیوٹر کے ذریعے کمپوز کرکے پیش کیے جاتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعے دین کی خدمت

انٹرنیٹ کی ویب سائٹ www.dawateislami.net کے ذریعے دنیا بھر میں دعوت اسلامی کا پیغام عام کیا جارہا ہے۔ اور دعوت اسلامی کی Website میں IMAM ASK THE پر دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرف سے پوچھے جانے والے مسائل کا حل، غیر مسلموں کے اسلام پر اعتراضات کے جوابات اور اُن کو اِسلام کی دعوت پیش کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔

مجلس تحقیقات شرعیہ

چونکہ دعوت اسلامی کے بانی مولانا محمد الیاس قادری، امام احمد رضا بریلویؒ☆(۱۴ جون ۱۸۵۶ء۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء) کو اپنا رہبر و رہنما مانتے ہیں، اس لئے مولانا محمد الیاس نے مجلس تحقیقات شرعیہ قائم کی ہے جو بزرگانِ دین، آئمہ مجتہدین اور امام احمد رضا بریلوی کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں اُمت کو پیش آمدہ جدید مسائل کا حل پیش کرتی ہے۔

☆ عالم دین، صوفی اور نعت گو شاعر تھے۔ عام طور پر اعلیٰ حضرت اور فاضل بریلوی کے نام

سے مشہور ہیں۔ پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا۔ ۱۸۶۹ء میں تمام علوم دینی و عقلی کی سند حاصل کر کے مسند افتا پر فائز ہوئے۔ آپ نے بعض علوم میں ذاتی مطالعے اور غور و فکر سے کمال پیدا کیا۔ خصوصاً ریاضی اور نجوم و فلکیات میں۔ ساری عمر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ قرآن مجید کا ترجمہ "کنز الایمان" کے نام سے کیا۔ آپ کا فقہی شاہکار "فتاویٰ رضویہ" ہے جو بارہ جلدوں میں بارہ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ شاعری میں آپ کا ذوق تسلیم حمد و ثنا اور نعت و منقبت کے علاوہ کسی اور صنف سخن کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ آپ کے مشہور زمانہ سلام کی گونج پاک و ہند کے گوشے گوشے سے سنی جاتی ہے۔

مصطفی جان رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام

(سید قاسم محمود، انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا، شاہکار بک فاؤنڈیشن، طبع اول، مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۱۔)

المدینۃ العلمیہ کا قیام

علمائے اہلسنت بالخصوص امام احمد رضاؒ کی کتب کی تسہیل اور غیر مطبوعہ کتب کو منظر عام پر لانے کے لیے المدینۃ العلمیہ قائم کی گئی ہے۔

تنظیم خدام المساجد

مساجد کی تعمیرات کے سلسلے میں تنظیم خدام المساجد کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو کروڑوں روپے خرچ کر کے تعمیرات مساجد کے کام میں مشغول ہے۔ دعوت اسلامی کے مراکز کی تعمیرات، جامعات و مدارس اور دیگر تبلیغی کاموں کے اخراجات مسلمانوں کے عطیات کے ذریعے پورے کیے جاتے ہیں۔ مگر ہر شخص کو چندہ جمع کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کے لیے دعوت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی اجازت ضروری ہے۔

مدنی مذاکرہ

دعوت اسلامی کے تحت ایسے مذاکروں کا بھی انتظام کیا جاتا ہے جن میں مولانا محمد الیاس قادری مختلف موضوعات مثلاً عقائد و اعمال، شریعت و طریقت، فقہ، طب، تاریخ، اور اورادو وظائف

وغیرہ پر پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیتے رہتے ہیں۔ ایسے مذاکروں کے لئے دعوت اسلامی میں مدنی مذاکرہ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ مدنی چینل کے ذریعے پوری دنیا میں مدنی مذاکرہ دیکھا اور پسند کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کو شرعی مسائل کا علم حاصل ہوتا ہے۔

تنظیمی نظم وضبط

مولانا محمد الیاس قادری دعوت اسلامی میں نظم و ضبط کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور تنقید کے حوالے سے بھی ایک طریقہ کار کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔"اگر آپ کسی اسلامی بھائی میں برائی پائیں تو دوسروں پر اظہار کرکے غیبت کا کبیرہ گناہ کرنے کے بجائے براہ راست اُسی کو نرمی کے ساتھ اکیلے میں سمجھائیں۔ اگر ناکامی ہو تو خاموشی اختیار کریں۔ اگر دینی نقصان کا اندیشہ ہو تو تنہائی میں یا لکھ کر اپنے یہاں کی مشاورت کے "ذیلی نگران" کا تعاون حاصل کریں جبکہ وہ مسائل حل کر سکتا ہو۔ ورنہ شریعت کے تقاضے پورے کرتے ہوئے مزید آگے مثلاً اپنی مشاورت کے "حلقہ نگران"، پھر تحصیل مشاورت کے نگران، پھر شہر مشاورت کے نگران، پھر ڈویژن کی مشاورت کے نگران، پھر صوبے کی مشاورت کے نگران، پھر ملک کی انتظامی کابینہ کے نگران سے رجوع کریں"[150]۔

مولانا محمد الیاس قادری کی مندرجہ بالا نصیحت کے نتیجے میں دعوت اسلامی انتہائی منظم انداز میں دعوت کا کام کر رہی ہے۔

اجتماعات میں بیان کے ضمن میں مولانا محمد الیاس قادری یہ شرائط عائد کرتے ہیں:

(۱)وہ مبلغین جو علم و عمل میں ممتاز ہوں گے اور تبلیغ کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں گے، اُن کو زبانی بیان کرنے کی اجازت ہوگی۔

(۲)وہ مبلغین جو علم میں ممتاز نہ ہوں گے وہ علمائے اہلسنت کی کتب سے حسب ضرورت فوٹو کاپیاں کرواکر اپنی ڈائری میں چسپاں کرکے اُنہیں دیکھ کر من و عن بیان کریں گے[151]۔

مندرجہ بالا شرائط میں لفظ علمائے اہلسنت، معنی خیز ہے اور بریلوی مسلک کو ظاہر کر رہا ہے۔

---

150 دعوت اسلامی کا تعارف، ص ۲۷، ۲۸۔

151 حوالہ سابق، ص ۲۹۔

دعوت اسلامی میں مسلکی تعصب بہت زیادہ ہے۔ مبلغین سوائے بریلوی مسلک کے علمائے کے، کسی بھی عالم کی کتاب کے پڑھنے کو اپنے لئے مناسب نہیں سمجھتے۔

دعوت اسلامی کی سرگرمیاں

دعوت اسلامی کے زیر انتظام مختلف سرگرمیاں سرانجام دی جاتی ہیں تاکہ تحریک کی فکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور لوگوں کو دعوت اسلامی میں شامل کیا جائے۔

ذیل میں سرگرمیوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے[152]۔

۱۔ فیضان سنت کا درس

تبلیغی جماعت میں فضائل اعمال نامی کتاب کا جو مقام ہے، دعوت اسلامی میں فیضان سنت کی وہی حیثیت ہے۔ مولانا محمد الیاس قادری کی مرتب کردہ اس کتاب میں ضعیف اور موضوع احادیث کی بھر مار ہے۔ دعوت اسلامی کے کارکنان مساجد میں نمازوں کے بعد فیضان سنت سے درس دیتے ہیں۔ بلاشبہ پاکستان اور بیرون ملک ہزاروں مساجد ایسی ہیں جہاں روزانہ نمازوں کے بعد فیضان سنت کا درس دیا جاتا ہے۔ یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ دعوت اسلامی میں قرآن مجید کی تفہیم پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا فیضان سنت کے درس پر دیا جاتا ہے۔

۲۔ نیکی کی دعوت

دعوت اسلامی کی سرگرمیوں میں سے ایک اہم سرگرمی نیکی کی دعوت ہے۔ مختلف گروپوں کی شکل میں لوگ محلوں میں نکلتے ہیں اور لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتے ہیں۔ اُنہیں فیضان سنت کے درس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ دعوت اسلامی کی افرادی قوت میں اضافہ کیا جائے۔ یہ طریقہ بھی تبلیغی جماعت کے گشت سے ملتا جلتا ہے۔

۳۔ مدنی قافلے

جس طرح تبلیغی جماعت میں شامل افراد سہ روزہ اور چلے (۴۰ روز) وغیرہ لگاتے ہیں، بالکل اسی طرح دعوت اسلامی میں شامل لوگ بھی دعوت دین کے لئے ۳دن، ۴دن، ۱۲دن، یا ۳۰دنوں کے لئے نکلتے ہیں۔ ہر قافلے میں کم از کم چھ افراد ہوتے ہیں جنہیں کسی گاؤں، شہر یا ملک میں بھیجا جاتا ہے۔ اگر

---

[152] www.dawateislami.net

چہ دعوت اسلامی صرف دین اسلام کے مذہبی گوشے سے بحث کرتی ہے اور وہ بھی بریلوی مسلک کی حدود سے محدود ہو کر، پھر بھی ان مدنی قافلوں سے بیشمار لوگ عبادات کے پابند ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان نسل دعوت اسلامی سے بے حد متاثر ہوئی ہے۔ کاش دعوت اسلامی دین اسلام کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی شعبوں میں بھی امت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی۔

۴۔ مدنی انعامات

مولانا محمد الیاس قادری نے دعوت اسلامی کے کارکنوں کے لئے قرآن و سنت کی روشنی میں ۲۷ نکات پر مشتمل ہدایات نامہ جاری کیا ہے۔ جسے مدنی انعامات کہا جاتا ہے، ہر مسلمان مرد اور عورت کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ممکنہ حد تک ان نکات پر عمل کریں تاکہ اُن کی زندگی رسول اکرم ﷺ کی زندگی کے مطابق گزر سکے۔

۵۔ ہفتہ وار اجتماع

دعوت اسلامی کے زیر اہتمام اجتماعات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ جن میں تنظیم کے مبلغین اپنے بیانات کے ذریعے لوگوں میں دین کا شعور بیدار کرتے ہیں۔

ہفتہ وار اجتماع ہر جمعرات کو مغرب کی نماز کے بعد بڑے بڑے شہروں کی اُن مساجد میں ہوتا ہے جہاں دعوت اسلامی کا مرکز ہو۔ ان اجتماعات میں قرآن مجید کی تلاوت کے بعد نعتیں پڑھی جاتی ہیں، مبلغین کے بیانات ہوتے یں، ذکر الٰہی کے بعد دعا ہوتی ہے۔ اس کے بعد لوگ مختلف چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ہر حلقے میں ایک مبلغ کسی خاص موضوع کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کی سنتیں بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد شرکاء اجتماع کھانا کھاتے ہیں اور تہجد تک آرام کرتے ہیں۔ تہجد اور فجر کی نماز کے بعد ایک مختصر بیان ہوتا ہے اور آخر میں صلاۃ و سلام پر یہ ہفتہ وار اجتماع اختتام کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح خواتین کیلئے جنھیں دعوت اسلامی میں اسلامی بہنیں کہا جاتا ہے، ہر اتوار کو فیضان مدینہ کراچی میں نماز ظہر سے نماز عصر تک اجتماع منعقد کیا جاتا ہے۔ دنیا کے دیگر شہروں میں بھی یہ اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔

دعوت اسلامی کے ہفتہ وار اور سالانہ اجتماعات بہت پر اثر ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں شرکت کرنے والے اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ غیر مستند واقعات اور قصے

کہانیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ میں نے ذاتی طور پر ان اجتماعات میں شرکت کر کے اپنے اندر تاثیر محسوس کی ہے۔

۶۔ مدنی تربیت گاہ

دعوت اسلامی کے زیر انتظام پاکستان اور بیرون ملک مختلف ادارے سر گرم عمل ہیں۔ ان اداروں کو مدنی تربیت گاہوں کا نام دیا جاتا ہے۔ ان تربیت گاہوں کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

i۔ قرآن پاک ناظرہ اور حفظ کی تعلیم دی جائے۔ نیز تجوید کے اصولوں کو طلباء کے ذہن نشین کرایا جائے۔

ii۔ ان تربیت گاہوں میں آٹھ سالہ شریعت کورس کرایا جاتا ہے تاکہ علماء کی ایسی کھیپ تیار کی جاسکے جو دعوت اسلامی کے کام کو آگے بڑھائے۔

iii۔ مدنی تربیت گاہوں میں طلباء کو سنت رسول ﷺ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اُن کے دلوں میں حضور اکرم ﷺ کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

iv۔ مختلف قسم کے مختصر کورسز مثلاً امام کورس، مبلغ کورس وغیرہ بھی مدنی تربیت گاہوں میں منعقد کیے جاتے ہیں۔

بلاشبہ مدنی تربیت گاہوں میں طلباء کو بہترین ماحول فراہم کیا جاتا ہے اور صاحبان علم و عمل کے زیر تربیت طلباء کے کردار پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خاص طور پور اُن کے اند صبر و حلم کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔

۷۔ مکتبہ المدینہ

دعوت اسلامی کا یہ شعبہ مذہبی کتابیں، کتابچے، پمفلٹ وغیرہ شائع بھی کرتا ہے اور تقسیم بھی۔ اس شعبے کے تحت آڈیو کیسٹس اور قرآت، نعت، تقاریر وغیرہ کی سی ڈیز بھی جاری ہوتی ہیں۔ اس شعبے کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان اور بیرون ملک اسلامی لٹریچر ارزاں قیمت پر زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔

۸۔ مجلس فیضان قرآن

مجلس فیضان قرآن دعوت اسلامی کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ یہ ایک غیر سیاسی مجلس ہے جس کے قیام کا مقصد معاشرے کے تمام طبقات کے لوگوں کی اخلاقی، دینی و اصلاحی تربیت کرنے اور انہیں

معاشرے کا با کردار شہری بنانا ہے۔ تاکہ دنیاو آخرت کی بہتری کے لئے ہر مسلمان اپنا مثبت ذہن بنا سکے کہ "مجھے اپنی اور ساری دنیا کے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرنی ہے۔" اصلاح اُمت کے جذبے کے تحت پاکستان کی کئی جیلوں میں دینی کام ہو رہا ہے۔ اس غیر سیاسی مجلس کے تحت قیدیوں کو قرآن و سنت، نماز، روزہ، قاعدہ، ناظرہ، حفظ قرآن، تجوید کورس، شریعت کورس، امامت کورس، ترجمہ و تفسیر کورس، مدرس کورس، عربی لینگوئج کورس، کرائے جا رہے ہیں۔ نیز معاشی استحکام کے لئے کمپیوٹر کورس، اور ٹیکنیکل کورسز بھی کرائے جاتے ہیں۔ پاکستان بھر میں ۴۰ سے زیادہ جیل مدارس قائم ہو چکے ہیں۔ سندھ کی ایک جیل میں قیدیوں کو باقاعدہ درس نظامی کرایا جا رہا ہے نیز کئی جیلوں میں ماہانہ اور ہفتہ وار اجتماع ذکر و نعت کا سلسلہ جاری ہے۔ سندھ کی جیلوں میں مجلس فیضان قرآن کی جانب سے مسجد، مدرسہ وغیرہ کی تعمیر کا کام ہو رہا ہے۔

مجلس فیضان قرآن کی کاوشیں جذوی حد تک قابل قدر ہیں۔ قیدیوں کو قرآن و سنت کی تعلیم کے ذریعے معاشرے کا سود مند شہری بنایا جا سکتا ہے اور یہ کام مجلس فیضان قرآن ایک حد تک انجام دے رہی ہے۔ کچھ اور تنظیمیں بھی اس مقصد کے لیے سرگرم ہیں مثلاً جماعت اسلامی۔

۹۔ مدنی چینل

دعوت اسلامی کے زیر انتظام ۲۰۰۸ء میں مدنی چینل کے نام سے ٹی وی چینل کا آغاز کیا گیا۔ یہ چینل پوری دنیا میں دعوت اسلامی کی سرگرمیوں کی نشر و اشاعت کا اہم ذریعہ ہے۔

تقابل دعوت اسلامی و تبلیغی جماعت

برصغیر پاک و ہند میں تبلیغی جماعت بھی دین اسلام کی دعوت کے اعتبار سے خاصی شہرت رکھتی ہے اور بلا مبالغہ یہ ایک بین الاقوامی تحریک بن چکی ہے کیونکہ اس تحریک کے وفود پوری دنیا میں اسلام کی تبلیغ کے لئے جاتے ہیں۔ دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے طریقہ کار میں کچھ چیزیں مماثلت رکھتی ہیں جبکہ کئی باتوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

مماثلت

i۔ دونوں تحریکیں دین اسلام کے بارے میں محدود تصور رکھتی ہیں۔ ان جماعتوں نے اسلام کو مذہب بنالیا ہے۔ یعنی چند عبادات اور رسومات کا مجموعہ۔ جبکہ اسلام کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام

کا نقشہ ان دونوں جماعتوں کی نظروں سے او جھل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت کبھی بھی دین اسلام کے غلبے کی بات نہیں کرتیں۔

ii۔ دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت افراد کی انفرادی اصلاح پر توجہ دیتی ہیں۔ معاشرے کی اجتماعی اصلاح کا ان دونوں کے پاس کوئی پروگرام نہیں۔ معاشرے میں اجتماعی سطح پر اگر اللہ رب العزت کے احکامات ٹوٹ رہے ہوں، سودی کاروبار عروج پر ہو، بے حیائی اور فحاشی زوروں پر ہو، کبھی بھی دعوت اسلامی یا تبلیغی جماعت کی طرف سے احتجاج نہیں ہو گا، کیونکہ یہ جماعتیں ایسے احتجاج کو وقت کا ضیاع سمجھتی ہیں۔

iii۔ دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت، افراد کی اصلاح کے لئے ایک خاص ماحول فراہم کرنے کی اہمیت پر بہت زور دیتی ہیں۔ تبلیغی جماعت میں افراد کو سہ روزہ، سات روزہ، چالیس دن (چلہ)، چار ماہ، نو ماہ اور ایک سال کے لئے تبلیغی کام میں مصروف رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح دعوت اسلامی میں افراد کو ۳دن، ۴دن، ۱۲دن، یا ۳۰دنوں کے لئے تبلیغی دوروں پر بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی بھی اصلاح کریں اور دوسروں کی اصلاح کے لئے بھی محنت کریں۔

iv۔ یہ بات عام مشاہدے کی ہے کہ تبلیغی دوروں کے دوران دونوں جماعتوں کے کارکنوں میں بہت زیادہ عاجزی اور انکساری دیکھنے میں آتی ہے۔ لیکن عام حالات میں یہی کارکن روکھے پن اور عدم تعاون کا رویہ ظاہر کرتے ہیں جس سے بے عمل لوگوں میں دین سے مزید دوری پیدا ہوتی ہے۔

v۔ دونوں جماعتوں نے ہدایت کا ذریعہ قرآن مجید کو نہیں بنایا۔ تبلیغی جماعت کا ذریعہ دعوت تبلیغی نصاب (فضائل اعمال) ہے اور دعوت اسلامی کا ذریعہ دعوت فیضان سنت نامی کتاب ہے۔

vi۔ دونوں جماعتوں میں ایک مماثلت یہ بھی ہے کہ دونوں کے بانیان کے نام محمد الیاس ہیں اور دونوں کے کارکن اپنے قائدین سے پرستش کی حد تک عقیدت رکھتے ہیں۔

vii۔ دونوں جماعتوں کے لٹریچر میں قتال فی سبیل اللہ کا کہیں تذکرہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ دونوں جماعتوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت میں جہاں مختلف معاملات میں مماثلت پائی جاتی ہے وہیں کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں دونوں جماعتوں میں اختلاف موجود ہے۔ ذیل میں اُن اختلافی نکات

کی وضاحت کی جاتی ہے۔

اختلافی نکات

i۔ دعوت اسلامی کے بانی مولانا محمد الیاس امام احمد رضا خاں بریلوی کے معتقد ہیں اور انہی کے نظریات کے پیروکار ہیں۔ گویا کہ دعوت اسلامی بریلوی مسلک کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس کے برعکس تبلیغی جماعت کے علماء اگرچہ یہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ اُن کا کسی مسلک سے تعلق نہیں لیکن اُن کا دعویٰ درست نہیں کیونکہ تبلیغی جماعت کے تمام علما دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود مولانا محمد الیاس بھی دارلعلوم دیوبند سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔

ii۔ دعوت اسلامی کے مبلغین اپنے بیانات میں حضور اکرم ﷺ کی سنتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ کا کھانا کھانا، آپ کا سونا، جاگنا، پانی پینا وغیرہ۔ نیز خوابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعے مولانا محمد الیاس کی محبت دلوں میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ تبلیغی جماعت کے مقررین اپنی گفتگو صرف چھ نمبروں تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ چھ نمبریوں ہیں۔ ۱۔ کلمہ طیبہ، ۲۔ نماز، ۳۔ علم وذکر، ۴۔ اکرام مسلم، ۵۔ اخلاص یعنی تصحیح نیت، ۶۔ دعوت تبلیغ۔

تبلیغی جماعت میں خواب بیان کرنے کی شدید حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ البتہ مختلف مقررین اپنے تبلیغی دوروں کی روداد ضرور بیان کرتے ہیں۔ اس روداد کے لئے تبلیغی جماعت میں 'کارگزاری' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

iii۔ دعوت اسلامی کے کارکن تبلیغی دوروں کے دوران صرف بریلوی مسلک کی مساجد میں جاتے ہیں اور صرف بریلوی مسلمانوں کو دعوت اسلامی میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ تبلیغی جماعت کے کارکنوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ تمام مسالک کی مساجد میں جائیں اور ہر طرح کے افراد سے مل کر اُنہیں تبلیغی جماعت میں شامل کریں۔ اس انداز تبلیغ کی وجہ سے بعض اوقات تبلیغی جماعت کے کارکنوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

iv۔ اگر فیضان سنت اور تبلیغی نصاب (فضائل اعمال) کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو تبلیغی نصاب میں ضعیف روایات کی تعداد فیضان سنت کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے۔

v۔ تبلیغی جماعت کا قیام ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا جبکہ دعوت اسلامی ۱۹۸۱ء میں قائم ہوئی۔ یہی

وجہ ہے کہ تبلیغی جماعت کا حلقہ اثر دعوت اسلامی کے مقابلے میں وسیع ہے۔

نتائج

i۔ دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے طریقہ کار کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دین حق کا غلبہ ان دونوں جماعتوں کے پیش نظر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم طاقتیں ان جماعتوں کو اپنے لیے خطرہ نہیں سمجھتیں۔

ii۔ ان جماعتوں کے اثر رسوخ کے تحت عام آدمی یہ سمجھنے لگ گیا ہے کہ اگر اس نے نماز، روزہ وغیرہ کی پابندی کر لی تو وہ جنت میں چلا جائے گا خواہ اس کا سارا کاروبار سود پر ہی کیوں نہ چل رہا ہو۔

iii۔ دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت نے مسلمانوں کو قرآن مجید سے بہت دور کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں جماعتیں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں۔

iv۔ دعوت اسلامی کے ماننے والے دوسرے مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھنے کو درست نہیں سمجھتے۔ یہی معاملہ تبلیغی جماعت کا ہے۔ اس طرح یہ دونوں جماعتیں مذہبی منافرت کو ہوا دیتی ہیں۔

خاتمہ کلام

تنظیم اسلامی نے قرآن مجید کو بنیاد بنا کر اپنے پیغام کو عام کرنے کی سعی کی ہے۔ بانی تنظیم کے بیان کردہ منہج انقلاب نبوی ﷺ سے بعض اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔ یہ سوال بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ کیا اقلیت ایک نظریہ کو درست سمجھتے ہوئے اکثریت پر اپنی سوچ مسلط کر سکتی ہے؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی نے پوری دنیا میں اثرات مرتب کیے ہیں، تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان جماعتوں نے دعوت و تبلیغ کے لیے قرآن مجید کو بنیادی ذریعہ کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا۔ تبلیغی جماعت میں فضائل اعمال نامی کتاب جبکہ دعوت اسلامی میں فیضان سنت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

تحریک ختم نبوت کے ذریعے رسول اکرم ﷺ کا مقام اور آنجناب کی حیثیت پوری دنیا میں واضح ہوئی ہے نیز قادیانیوں کی سازشوں سے سادہ لوح مسلمانوں کو آگاہ کرنے کا سہرا بھی تحریک ختم نبوت کے سر ہے۔

مصنف اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ تنظیم اسلامی، تبلیغی جماعت اور تحریک ختم نبوت کے اکابرین کا اخلاص بے مثال ہے۔ کسی جماعت کے طریقہ کار اور نظریات سے اختلاف کا مطلب ہر گز یہ نہیں لینا چاہیے کہ جماعت کے بانی یا دیگر علماء کرام کی نیتوں پر شک کیا جا رہا ہے۔ ادب کے ساتھ اختلاف کرنے اور دلیل کے ساتھ جواب دینے کی روایت کو مضبوط ہونا چاہیے۔

آخر میں اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ حق کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

کتابیات

اُردو کتابیں

۱۔ القرآن، مجمع الملک فھد لطباعۃ المصحف الشریف، الریاض، السعودی العربیہ۔

۲۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، ”سنن ابی داؤد“، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، نومبر ۲۰۰۵ء۔

۳۔ ابو مجاہد، ”عصر حاضر کے جدید مسائل اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری“، اشاعت سوم، اسلام آباد، مئی ۱۹۹۷ء۔

۴۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، ”تحریکِ جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ“، ناشر مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، نومبر ۱۹۰۵ء۔

۵۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، ”مولانا مودودی مرحوم اور میں“ اشاعت سوم، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، نومبر ۲۰۰۶ء۔

۶۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، ”تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب“، اشاعت سوم، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، نومبر ۲۰۰۶ء۔

۷۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، ”تعارف تنظیم اسلامی“، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، دسمبر ۲۰۰۴ء۔

۸۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، ”جہاد فی سبیل اللہ“، اشاعت دوم، ناشر شعبہ دعوت تنظیم اسلامی، لاہور، فروری ۲۰۰۷ء۔

۹۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، ”تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر“، اشاعت دوم، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، اگست ۱۹۹۲ء۔

۱۰۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، ”منہج انقلاب نبوی ﷺ“، اشاعت پنجم، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، اپریل ۱۹۹۵ء۔

۱۱۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، ”سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی حال اور مستقبل اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری“، مکتبہ انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۱۲۔ ابو مدثرہ، ”قادیان سے اسرائیل تک“، عالمی مجلس احرار اسلام، ملتان پاکستان، ۱۹۸۹ء۔

۱۳۔ امیر حمزہ، مولانا، ”قافلہ دعوت وجہاد“، ناشر دارالاندلس، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۱۴۔ اللہ وسایا، ”تحریک ختم نبوت“ اشاعت اوّل، عالمی تحفظ ختم نبوت، ملتان، ۱۹۹۱ء۔
۱۵۔ افتخار فریدی (مرتب)، ”ارشادات و مکتوبات بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس قادری“، نوید پبلشرز اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۰ء۔
۱۶۔ اعظمی، الطاف احمد، ”احیائے ملت اور دینی جماعتیں“، دارالتذکیر اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء۔
۱۷۔ افضل حق، چوہدری، ”تاریخ احرار“، لاہور، ملتان، ۱۹۲۶ء۔
۱۸۔ الیاس برنی، پروفیسر، ”مقدمہ قادیانی مذہب قادیانی قول و فعل“، ملتان، ۲۰۰۱ء۔
۱۹۔ امر تسری، ثناء اللہ، مولانا، ”عقائد مرزا“، امر تسر، ۱۹۳۳ء۔
۲۰۔ امر تسری، ثناء اللہ، مولانا، ”علم کلام“، امر تسر، ۱۹۲۶ء۔
۲۱۔ بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، ”الجامع الصحیح البخاری“، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۹۸ء۔
۲۲۔ برق، غلام جیلانی، ”حرف مجرمانہ“، لاہور، س ن۔
۲۳۔ بریلوی، احمد رضا، ”ختم النبوۃ“، لاہور، ۱۹۸۳ء۔
۲۴۔ بشیر احمد، مرزا، ”تبلیغی ہدایت“، دیوبند، انڈیا، ۱۹۴۵ء۔
۲۵۔ بشیر احمد، مرزا، ”سیرت المہدی“ اشاعت دوم، احمدیہ کتاب گھر، قادیان، ۱۹۳۵ء۔
۲۶۔ بھٹی، محمد اسحاق، ”بزم ارجمنداں“، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء۔
۲۷۔ جانباز مرزا، ”حیات امیر شریعت“، اشاعت اوّل، لاہور، ۱۹۶۹ء۔
۲۸۔ چراغ، محمد علی، ”اکابرین تحریک پاکستان“ لاہور، ۲۰۰۳ء۔
۲۹۔ حبیب، سید، مولانا، ”تحریک قادیان“، لاہور، ۱۹۳۳ء۔
۳۰۔ خالد بشیر احمد، ”تاریخ محاسبہ قادیانیت“، نفیس پرنٹنگ پریس، فیصل آباد، دسمبر ۱۹۷۹ء۔
۳۱۔ دبیر، محمد کرم الدین، مولانا، ”آفتاب ہدایت، رد رفض و بدعت“، چکوال، ۱۹۷۳ء۔
۳۲۔ رفیق دلاوری، ابو القاسم، مولانا، ”آئمہ تلبیس“، لاہور، ۱۹۸۷ء۔
۳۳۔ شورش کاشمیری، ”تحریک ختم نبوت“، اشاعت دوم، مطبوعہ چٹان، لاہور، ۱۹۸۰ء۔
۳۴۔ شیر وانی، لطیف احمد، حرف اقبال، لاہور، س ن۔
۳۵۔ صفدر، محمد سرفراز، مولانا، ”ختم نبوت کتاب و سنت کی روشنی میں“، گوجرانوالہ، ۱۹۹۲ء۔

۳۶۔ طاہر القادری، ڈاکٹر، ''عقیدہ ختمِ نبوت پر مرزائے قادیان کے متضاد مؤقف''، منہاج القرآن پبلشرز،
لاہور،۱۹۹۷ء۔
۳۷۔ عبدالشکور ترمذی، سید، ''دعوت تبلیغ کی شرعی حیثیت''، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۱ء۔
۳۸۔ عبدالمجید ساجد، خان، ''ختم نبوت اور عقیدہ اقبال''، ملتان، ۱۹۹۷ء۔
۳۹۔ غلام احمد، مرزا، ''کتاب البرید''، اشاعت دوم، قادیان، دسمبر ۱۹۳۲ء۔
۴۰۔ غلام احمد، مرزا، ''تتمہ حقیقتہ الوحی''، قادیان، ۱۹۲۳ء۔
۴۱۔ غلام احمد، مرزا، ''توضیح المرام''، ریاض الہند پریس، امرتسر، ۱۹۲۲ء۔
۴۲۔ غلام احمد، مرزا، ''مکتوبات احمد''، قادیان، سن ن۔
۴۳۔ غلام احمد، مرزا، ''ازالہ اوہام''، قادیان، سن ن۔
۴۴۔ غلام احمد، مرزا، ''ایک غلطی کا ازالہ''، قادیان، سن ن۔
۴۵۔ غلام احمد، مرزا، ''کشتی نوح''، قادیان، ۱۹۰۴ء۔
۴۶۔ غلام احمد، مرزا، ''شہادت القرآن''، الشرکتہ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ، س ن۔
۴۷۔ قادیانی، قسیم علی، میر، ''تبلیغ رسالت''، قادیان، سن ن۔
۴۸۔ کاندھلوی، محمد زکریا، مولانا، ''فضائل اعمال''، کتب خانہ فیضی، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۶ء۔
۴۹۔ مبارکپوری، صفی الرحمن، ''الرحیق المختوم''، مکتبہ السلفیہ، لاہور، نومبر ۱۹۹۵ء۔
۵۰۔ محمد رفیق، پروفیسر، ''تحریک منہاج القرآن کے ابتدائی پندرہ سال''، منہاج القرآن پبلشرز، لاہور، جنوری ۱۹۹۸ء۔
۵۱۔ محمد رفیق، پروفیسر، ''تحریک منہاج القرآن کے مراحل خمسہ''، منہاج القرآن پبلشرز، لاہور، اگست ۱۹۹۶ء۔
۵۲۔ محمد رمضان، قادری (مرتب)، ''تربیتی خطاب، پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری''، منہاج القرآن پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔
۵۳۔ محمد احمد، قاری، مولانا، ''تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے''، نوید پبلشرز اردو بازار، لاہور، اگست ۲۰۰۳ء۔

۵۴۔ محمد اکرام، شیخ، ”موج کوثر“ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۲ء۔
۵۵۔ مسلم بن حجاج، قشیری، ”الجامع الصحیح“، دارلاسلام پبلیشرز لاہور، نومبر ۲۰۰۲ء۔
۵۶۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، ”پردہ“، اسلامک پبلیکشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء۔
۵۷۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، ”قادیانی مسئلہ“، اسلامک پبلیکشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔
۵۸۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، ”تفہیم القرآن“، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۵ء۔
۵۹۔ ندوی، ابوالحسن علی، سید، ”قادیانیت، مطالعہ و جائزہ“، اشاعت پنجم، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۵ء۔
۶۰۔ ندوی، ابوالحسن علی، سید، ”مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت“، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۸ء۔
۶۱۔ ولی الدین، خطیب، محمد بن عبداللہ، ”مشکوٰۃ المصابیح“، ناشران قرآن لیمیٹڈ، لاہور، دسمبر ۲۰۰۳ء۔

English Book

1. Anwar-ul-Haq, The Faith Movement of Moulana Muhammad Ilyas, London: Alten, 1972.

رسائل وجرائد

۱۔ الفضل، اربعین نمبر، جلد نمبر ۱۲، قادیان، دسمبر ۱۹۰۰ء
۲۔ ترجمان القرآن (ماہنامہ)، جلد نمبر ۵، لاہور، مئی ۲۰۰۷ء۔
۳۔ حکمتِ قرآن (ماہنامہ)، جلد نمبر ۶، لاہور، جون ۲۰۰۵ء۔
۴۔ منہاج القرآن (ماہنامہ)، جلد نمبر ۲، فروری ۱۹۹۶ء۔
۵۔ میثاق (ماہنامہ)، جلد نمبر ۳، لاہور، مارچ ۱۹۷۶ء۔
۶۔ آتش فشاں (پندرہ روزہ)، جلد نمبر ۱۰، مئی ۱۹۸۱ء۔
۷۔ ندائے خلافت (ہفت روزہ)، جلد نمبر ۱۲، لاہور، مارچ ۲۰۰۳ء۔
۸۔ چٹان (ہفت روزہ)، جلد نمبر ۱۲، لاہور، اپریل ۱۹۷۳ء۔

کتابیات

اخبارات

۱۔ پاکستان ٹائمز، راولپنڈی، مئی ۱۹۷۳ء۔

۲۔ جسارت، کراچی، مئی ۱۹۷۴ء۔

۳۔ نوائے وقت، ملتان، نومبر ۲۰۰۵ء۔

انٹرویوز

۱۔ انٹرویو رحمت اللہ بٹر (غیر مطبوعہ)، جون ۲۰۰۷ء۔

۲۔ پروفیسر حافظ محمد سعید، نوائے وقت، اکتوبر ۲۰۰۴ء۔

۳۔ سمیعہ راحیل قاضی، نوائے وقت، اپریل ۲۰۰۷ء۔

انسائیکلوپیڈیا

۱۔ حامد علی خان، "اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا"، جلد اوّل، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

۲۔ سید قاسم محمود، "انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا"، اشاعت اوّل، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۳۔ مقصود ایاز / محمد ناصر، "شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا"، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

Internet Web Sites

http: //www.meforum.org/article/686.

http: //www.onlinenews.com.pk/articledetails.php?id=37658.

http: //www.darsequran.com/articles/english/tablighijamat.php.

http: //www.dawateislami.net

غلام حیدر شعبہ علوم اسلامیہ ، فیکلٹی آف اسلامک اینڈ عریبک اسٹڈیز، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر فرائض منصبی سرانجام دے رہے ہیں۔

http://asianindexing.com

9 786277 680015